دعوتی و تحریکی نقطہ نگاہ سے امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کی ایک نہایت اہم تالیف

"نبی اکرم ﷺ کا مقصد بعثت"

کا انگریزی ترجمہ درج ذیل عنوان کے تحت شائع ہو گیا ہے

The Objective and Goal of MUHAMMAD S PROPHETHOOD (SAW)

صفحات ۵۶، دبیز سفید کاغذ، عمدہ طباعت، دیدہ زیب ٹائٹل، قیمت -/۳۶

مزید برآں

امیر تنظیم اسلامی کے سیاسی افکار اور تحریکی سرگرمیوں کی تفصیل پر مشتمل

محترمہ شگفتہ احمد کا ایک تحقیقی مقالہ (بزبان انگریزی)

جسے موصوفہ نے کینیڈا کی میک گل یونیورسٹی میں ایم اے کے تھیسس کے طور پر مرتب کیا تھا

DR. ISRAR AHMAD S Political Thought and Activities

کے عنوان سے کتابی صورت میں شائع کر دیا گیا ہے۔

صفحات ۱۶۸، سفید کاغذ، عمدہ آفسٹ طباعت، قیمت : مجلد -/۱۰۰، پیپر بیک -/۷۲

شائع کردہ : مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

7/4/97

وَمَن يُؤتَ الحِكمَةَ فَقَد اُوتِيَ خَيرًا كَثِيرًا

(البقرة : ٢٦٩)

ماهنامہ

حکمتِ قرآن

لاھور

بیادگار: ڈاکٹر محمد رفیع الدین ایم اے پی ایچ ڈی ڈی لٹ مرحوم

مدیر اعزازی: ڈاکٹر ابصار احمد ایم اے ایم فل پی ایچ ڈی

معاون: حافظ عاکف سعید ایم اے (فلسفہ)

ادارہ تحریر: پروفیسر حافظ احمد یار، حافظ خالد محمود خضر

جلد ۱۶ | ذوالحجہ ۱۴۱۷ھ —— اپریل ۱۹۹۷ء | شمارہ ۴

— یکے از مطبوعات —

مرکزی انجمن خدام القرآن لاھور

۳۶۔کے۔ماڈل ٹاؤن۔لاھور ۱۴۔ فون: ۵۸۶۹۵۰۱

کراچی آفس: ۱۱۔داؤد منزل متصل شاہ بکری۔شاہراہ لیاقت کراچی فون: ۲۱۶۵۸۶

سالانہ زرِ تعاون ۸۴/- روپے، فی شمارہ ۸/- روپے

مطبع: آفتاب عالم پریس ہسپتال روڈ لاہور

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

حرفِ اول

احباب جانتے ہیں کہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور گزشتہ ربع صدی سے قرآنی تعلیمات کی وسیع پیمانے پر نشرو اشاعت کے علاوہ علوم و معارف قرآنی کی اعلیٰ علمی سطح پر توضیح و تبیین میں بھی مصروف ہے۔ اس کے لئے ہفتہ وار دروس قرآن کے انعقاد' ماہانہ اور ہفتہ وار جرائد کی اشاعت کے علاوہ قرآنی محاضرات (Quranic Seminars) کا اہتمام بھی مرکزی انجمن کے تحت باقاعدگی سے کیا جاتا ہے۔ گزشتہ سال سے ایک سہ ماہی انگریزی جریدے (Quranic Horizons) کا اجراء بھی اسی سلسلے کی ایک اہم کوشش ہے۔

یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ وطن عزیز کی بقا اور اس کے استحکام کا راز یہاں شریعتِ اسلامی کے صحیح معنوں میں نفاذ یعنی نظام خلافت کے قیام ہی میں پوشیدہ ہے۔ جس کے لئے ڈاکٹر اسرار احمد صاحب مختلف سطحوں پر گزشتہ پچیس تیس برسوں سے سرگرم عمل ہیں۔ وزیر اعظم جناب میاں محمد نواز شریف صاحب کی سربراہی میں مسلم لیگ کی حکومت سے "مطالبۂ تکمیلِ دستورِ اسلامی" بھی اسی کوشش کی ایک اہم کڑی ہے جس کا آغاز حال ہی میں محترم ڈاکٹر صاحب نے کیا ہے۔ اس لئے کہ جس مثالی اسلامی ریاست کے قیام کا خواب مفکر پاکستان علامہ اقبال اور معمارِ پاکستان قائداعظم محمد علی جناح نے دیکھا تھا' وہ اس کے بغیر شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ قارئین کے لئے ہمارا مشورہ ہے کہ وہ ہفت روزہ "ندائے خلافت" کے تازہ شمارہ کا' جو پاکستان میں دستور سازی کی تاریخ اور دستور پاکستان میں اسلامی دفعات کی تدریجی شمولیت کی تفصیلات پر مبنی ہے' مطالعہ ضرور فرمائیں اور حتی المقدور اس مہم میں اپنا حصہ ڈالیں!

احباب نوٹ فرمالیں کہ مرکزی انجمن کی شوریٰ اور مجلس عاملہ کے فیصلے کے مطابق ۲۰ اور ۲۱/اپریل ۹۷ء کو بعد نماز مغرب محاضراتِ قرآنی کی مجالس کے انعقاد کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ جن میں "قرآن' اقبال اور پاکستان" کے موضوع پر دانش ور حضرات اپنے مقالے پیش کریں گے۔ یہ پروگرام ان شاء اللہ دونوں دن' بعد نماز مغرب قرآن آڈیٹوریم (اتاترک بلاک' نیو گارڈن ٹاؤن) لاہور میں منعقد ہو گا۔

ع صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے!

سلسلۂ تقاریر تعارفِ الکتاب

ڈاکٹر اسرار احمد

اَمَّنْ خَلَقَ ۲۰

نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ حَدَآئِقَ
ذَاتَ بَهْجَةٍ مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُنْۢبِتُوْا شَجَرَهَا ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ بَلْ هُمْ قَوْمٌ يَّعْدِلُوْنَ (النمل)

قرآن مجید کا بیسواں پارہ "اَمَّنْ خَلَقَ" کے نام سے موسوم ہے اور اس میں پہلے سورۃ النمل کی بقیہ چونتیس (۳۴) آیات شامل ہیں، پھر سورۃ القصص مکمل اور آخر میں سورۃ العنکبوت کی پہلی چوالیس (۴۴) آیات شامل ہیں۔ سورۃ النمل کا جو حصہ اس پارے میں وارد ہوا ہے اس میں اکثر و بیشتر وہی مضامین، اسلوب اور اندازِ بیان کسی قدر فرق کے ساتھ وارد ہوتے ہیں جو اکثر مکی سورتوں میں آتے ہیں، یعنی آفاق و انفس کے شواہد اور دلائلِ فطرت سے توحیدِ باری تعالیٰ، معاد و آخرت اور نبوت و رسالت کا اثبات، بالخصوص ایمان بالآخرۃ پر اس سورۂ مبارکہ میں بہت زور دیا گیا ہے۔ اس ضمن میں منکرینِ آخرت کے طرزِ عمل پر ایک بہت بھرپور تبصرہ کیا گیا ہے، ارشاد ہوتا ہے: بَلِ ادّٰرَكَ عِلْمُهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْهَا بَلْ هُمْ مِّنْهَا عَمُوْنَ ۝ (آیت ۶۶) ان لوگوں کا علم و فہم، ان کی دانش، ان کا شعور اور ان کی سمجھ سب تھک ہار کر رہ گئے۔ یعنی آخرت تک ان کی رسائی نہیں ہو پا رہی۔ آخرت کے بارے میں شکوک و شبہات میں مبتلا ہیں بلکہ وہ آخرت کے باب میں تو بالکل اندھے ہو گئے ہیں کہ انہیں بالکل نہیں سوجھ رہا کہ ان کی اصل زندگی وہ ہے جو موت کے بعد شروع ہو گی اور ان کا وہ انجام جس سے بہرحال ان کو دوچار ہو کر رہنا ہے آخرت کے ساتھ وابستہ ہے۔

اس کے بعد سورۃ القصص وارد ہوئی ہے۔ اس سورۂ مبارکہ کا تقریباً نصف حضرت موسیٰ علیہ السلام

کے حالات پر مشتمل ہے۔ اس میں بالخصوص ان کے بچپن کے حالات' عنفوانِ شباب کے حالات اور پھر ان کی زندگی کا وہ دور بھی جب کہ وہ نبوت سے سرفراز ہونے سے قبل فرعون اور اس کی قوم کی طرف سے قتل یا تشدد کے اندیشہ سے مصر سے فرار ہو کر مدین پہنچے تھے جب وہ مدین پہنچے تو بستی میں سے باہر ایک کنوئیں کے پاس بیٹھ گئے' اس حال میں کہ انتہائی درماندہ تھکے ہوئے ہیں اور ایک ایسی سرزمین میں جہاں کوئی جاننے پہچاننے والا نہیں۔ اس وقت ان پر جو احتیاج کی کیفیت تھی اس کی شدت کا اظہار ان الفاظ میں ہوا جو ان کی زبان پر دعا کی صورت میں وارد ہوئے: رَبِّ اِنِّیْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَیْرٍ فَقِیْرٌ (آیت ۲۴) اے رب میں ہر چیز کا محتاج ہوں' جو بھلائی اور جو خیر بھی تو میری جھولی میں ڈال دے میں اس کا ضرورت مند ہوں۔ یہ ایک انسان کا جو معاملہ اپنے رب کے ساتھ ہونا چاہیے' احتیاج' انکساری اور عاجزی کا جو انداز اسے اختیار کرنا چاہیے' اس کی تعبیر کے لیے بہت ہی جامع الفاظ ہیں۔

سورۃ القصص میں بنی اسرائیل کے ایک شخص کا ذکر بھی ہوا ہے جس کا نام قارون تھا اور جو بہت دولت مند تھا۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی قوم کا غدار تھا۔ اگرچہ بنی اسرائیل سے تعلق رکھتا تھا لیکن بنی اسرائیل پر ستم اور ظلم ڈھانے میں وہ فرعون اور آلِ فرعون کا آلۂ کار بنا ہوا تھا اور غالباً اسی وجہ سے حکومتِ وقت کی اس پر نگاہِ کرم تھی اور اسی بنا پر اس کے پاس اتنی بے اندازہ دولت جمع ہو گئی تھی کہ اس کے خزانے کی کنجیاں اٹھانے کے لیے بھی کئی تنومند لوگ درکار تھے۔ اس کے بارے میں ایک بات تو یہ بیان ہوئی کہ جب بنی اسرائیل کے کچھ نیک دل لوگوں نے اس سے یہ کہا: اَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ (آیت ۷۷) کہ اے اللہ کے بندے جس طرح خدا نے تیرے ساتھ بھلائی کی ہے' تجھے دولت سے نوازا ہے' تو بھی اللہ کی مخلوق سے بھلائی کر اور لوگوں کی احتیاجات دور کرنے کے لیے اپنی دولت خرچ کر۔ تو اس کا جواب اس نے انتہائی متکبرانہ انداز میں دیا کہ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ (آیت ۷۸) میں نے یہ دولت اپنی ذہانت اور فطانت سے حاصل کی ہے' یہ میری محنت کا نتیجہ ہے' اس کو میں نے اپنی کوششوں سے حاصل کیا ہے تو میں اسے دوسروں پر کیسے صرف کروں؟ یہ درحقیقت کسی بھی متکبر اور مغرور اور بر خود غلط شخص جس کے پاس دولت آگئی ہو' کی ذہنیت کی عکاسی کرنے والے الفاظ ہیں۔ ساتھ ہی ایک اور نقشہ بھی سامنے لایا گیا ہے

بنی اسرائیل میں سے کچھ لوگ اس کی دولت پر رشک کرتے تھے' ان کے الفاظ نقل ہوئے ہیں : یٰلَیْتَ لَنَا مِثْلَ مَآ اُوْتِیَ قَارُوْنُ ٥ (آیت ۷۹) کاش کہ ہمارے پاس بھی وہی کچھ ہوتا جو قارون کو دیا گیا ہے لیکن جب اللہ کی پکڑ قارون پر آئی اور اللہ تعالیٰ نے اسے اس کے خزانوں سمیت زمین میں دھنسا دیا تو وہی لوگ جو کل تک تمنا کرتے تھے کہ کاش ہمارے پاس بھی قارون ہی کی طرح کی دولت ہوتی انہوں نے یہ الفاظ کہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کا فضل ہم پر نہ ہوتا تو ہم بھی زمین میں دھنس گئے ہوتے۔ معلوم ہوا کہ لوگوں کو ظاہر سے دھوکہ نہیں کھانا چاہیئے' مال و اسبابِ دنیوی درحقیقت اللہ کی رضا کی علامت نہیں ہیں' اللہ کبھی یہ چیزیں دے کر کسی کو آزماتا ہے اور جب وہ شخص ناکام ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی پکڑ اسے اسی دنیا میں ہی آ لیتی ہے اور کبھی اس کا معاملہ آخرت کے لیے اٹھا رکھا جاتا ہے۔

اس کے بعد مصحف میں سورۃ العنکبوت آتی ہے۔ اس سورۂ مبارکہ میں تمام تر خطاب کا رخ مسلمانوں کی طرف ہے اور اس کا اہم ترین مضمون یہ ہے کہ مسلمانو! مشکلات و مصائب اور شدائد و تکالیف سے دل برداشتہ نہ ہو۔ یہ ہماری سنتِ سابقہ ہے' یہ ہمارا ہمیشہ کا طریقہ رہا ہے کہ جس نے بھی ایمان کا دعویٰ کیا ہے ہم نے اسے آزمایا ہے۔ یہ آزمائش اس راہ میں لازمی شے ہے' اس لیے کہ اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ کون واقعی مومن ہے اور کون جھوٹ موٹ کا مومن بنا پھرتا ہے۔ فرمایا : اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَھُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ (آیت ۲) کیا لوگوں نے یہ سمجھا تھا کہ وہ چھوڑ دیئے جائیں گے صرف یہ کہنے پر کہ وہ ایمان لے آئے اور انہیں آزمایا نہ جائے گا۔ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ (آیت ۳) حالانکہ ہم نے ہمیشہ آزمایا ہے ان کو جو ان سے پہلے ہو گزرے ہیں : فَلَیَعْلَمَنَّ اللّٰہُ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا وَلَیَعْلَمَنَّ الْکٰذِبِیْنَ ٥ (آیت ۳) اور اللہ تعالیٰ تو بالکل کھول کر رکھ دے گا کہ کون سچے ہیں اپنے دعویٰ ایمان میں اور کون جھوٹے ہیں۔ آگے چل کر اسی بات کو اور کھول دیا گیا : وَلَیَعْلَمَنَّ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَیَعْلَمَنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ ٥ (آیت ۱۱) اور اللہ تعالیٰ بالکل کھول کر رکھ دے گا کہ کون ہے مومنِ صادق اپنے دعوئ ایمان میں اور کون ہے منافق۔ اہل ایمان مومنینِ صادقین اور منافقین کے مابین امتیاز انہی آزمائشوں کے طفیل ممکن ہے۔ اسی سے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی جدا ہو سکتا ہے۔

اس سورۂ مبارکہ میں قصص الانبیاء اور انباء الرسل بھی بیان ہوئے' لیکن ان میں بھی اصل پہلو یہی ہے کہ مسلمانوں کو متوجہ کیا جا رہا ہے کہ جس راستے پر تم چل رہے ہو یہ پھولوں بھرا راستہ کبھی نہ تھا۔

یہ ہمیشہ کانٹوں سے بھرا رہا ہے۔ ہمارے نبیوں اور ہمارے رسولوں نے ہمیشہ صبر و استقامت کا معاملہ کیا ہے۔ ان میں سے مثلاً حضرت نوح علیہ السلام نے ساڑھے نو سو برس تک دعوت دی' اس کے باوجود ان پر ایمان لانے والوں کی تعداد انگلیوں پر گنی جانے والی تھی۔ معلوم ہوا کہ اس راہ پر صبر و ثبات کے ساتھ دعوت و تبلیغ کا فریضہ سرانجام دیتے چلے جانا' یہ ہے انبیاء کرام اور ان کے ماننے والوں کا فرضِ لازم اور فرضِ منصبی۔ نتائج کو اللہ کے حوالے کرنا چاہیے' اور اس راہ کے شدائد و مصائب اور آسائشوں سے دل برداشتہ نہیں ہونا چاہیے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

TO CHRISTIANS WITH LOVE

Based on the lectures delivered by
Dr. Israr Ahmad

Price Rs. 8.00

Markazi Anjuman Khuddam-ul-Qur'an, Lahore

احباب نوٹ فرمالیں!

انجمن خدام القرآن سندھ' کراچی کے دفتر میں اب ای میل (E.Mail) کی سہولت موجود ہے۔ کوڈ حسب ذیل ہے:

anjuman@anjuman.khi.erum.com.pk.

درس ۵

سُورۃ الفاتحۃ

قرآن حکیم کے فلسفہ و حکمت کی اساسِ کامل

نَحمدہٗ ونصلّی علٰی رسولہِ الکریم

اعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم ○ بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ○ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ○ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ○ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ○ ﴾ (آمین)

اللہ تعالیٰ کے نام سے ہم آج کی صحبت میں اس سورۂ مبارکہ کے مطالب و مفاہیم سمجھنے کی کوشش کریں گے' جو ہماری نمازوں کا جزو لازم ہے اور جس کو خود اللہ تعالیٰ نے "القرآن العظیم" سے موسوم فرمایا ہے۔ دین سے ادنیٰ شغف رکھنے والے ہر شخص کو بھی یہ سورۂ مبارکہ لازماً یاد ہوتی ہے۔ تاہم مناسب ہو گا کہ ہم اس سورۂ مبارکہ کے مطالب پر غور کرنے سے قبل اس کا سلیس اردو ترجمہ ذہن نشین کر لیں :

"کل شکر اور کل ثناء اللہ کے لئے ہے جو تمام جہانوں کا مالک اور پروردگار ہے۔ بہت رحم کرنے والا اور نہایت مہربان ہے۔ جزا و سزا کے دن کا مالک و مختار ہے۔ (اے رب!) ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور کریں گے' اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں اور چاہیں گے۔ ہمیں سیدھی راہ کی ہدایت بخش۔ ان لوگوں کی راہ کی جن پر تیرا انعام ہوا' جن پر نہ تیرا غضب نازل ہوا اور نہ ہی وہ گمراہ ہوئے۔" (آمین!)

چند تمہیدی اور بنیادی باتیں

سب سے پہلے مجھے اس سورۂ مبارکہ کے بارے میں چند تمہیدی باتیں عرض کرنی ہیں اور اس کے مضامین کا اجمالی تجزیہ پیش کرنا ہے۔ اللہ سے دعا ہے کہ قارئین کرام ان کو گن کر اچھی طرح ذہن نشین فرمالیں اور انہیں ہمیشہ مستحضر رکھیں۔

سب سے پہلے نازل ہونے والی مکمل سورۃ

پہلی بات یہ ہے کہ یہ سب سے پہلی مکمل سورۃ ہے جو نبی اکرم ﷺ پر نازل ہوئی۔ اس سے قبل متفرق آیات نازل ہوئیں۔ مثلاً وہ پانچ آیات جو سورۃ العلق کے ابتداء میں شامل ہیں۔ اور اس پر تقریباً اجماع ہے کہ وہ سب سے پہلی وحی ہے۔ اکثر محققین کے نزدیک دوسری وحی وہ سات آیات ہیں جو سورۂ "ن" (جس کا دوسرا نام سورۃ القلم بھی ہے) کے آغاز میں شامل ہیں۔ پھر تیسری وحی سورۃ المزّمل کی ابتدائی سات آیات ہیں اور چوتھی وحی سورۃ المدّثر کی ابتدائی سات ہی آیات ہیں' جبکہ پانچویں وحی جو محمد رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوئی وہ یہ سورۂ فاتحہ ہے جو پہلی مکمل سورت ہے۔ پھر حسن اتفاق دیکھئے کہ یہ سورۂ مبارکہ بھی سات ہی آیات پر مشتمل ہے۔

سورۃ الفاتحہ کی عظمت

دوسری بات اس سورۂ مبارکہ کی عظمت کے بارے میں ہے۔ اس ضمن میں ایک تو خود اللہ تعالیٰ کا اپنا فرمان ہے۔ چنانچہ چودھویں پارے میں سورۃ الحجر میں یہ آیت وارد ہوئی ہے:

﴿وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ ۝﴾

"(اے نبیؐ!) بے شک ہم نے آپؐ کو عطا فرمائی ہیں سات دہرائی جانے والیاں (یعنی وہ سات آیات جو بار بار پڑھی جاتی ہیں۔ نماز کی ہر رکعت میں ان کا اعادہ ہوتا ہے) اور قرآن عظیم (عطا فرمایا)۔"

اس آیت کے بارے میں مفسرین کا تقریباً اجماع ہے کہ "سَبْعًا مِنَ الْمَثَانِی" سے مراد بھی سورۂ فاتحہ کی سات آیات ہیں اور "القرآن العظیم" بھی اسی سورۂ مبارکہ کو قرار دیا گیا ہے۔ گویا اس سورۂ مبارکہ کی عظمت یہ ہے کہ یہ بجائے خود ایک مکمل قرآن ہے' اور نہ صرف قرآن بلکہ "قرآنِ عظیم" ہے۔ سورۃ الحجر کا وہ مقام جس میں یہ آیۂ مبارکہ وارد ہوئی ہے وہ ہے جہاں اللہ تعالیٰ نبی اکرم ﷺ کو صبر کی تلقین فرما رہے ہیں اور ساتھ ہی اپنا یہ احسان اور فضل بھی بیان فرما رہے ہیں کہ اے نبی ہم نے آپ کو اتنی بڑی نعمت عطا فرمائی ہے جتنی بڑی نعمت کسی اور کو نہیں دی' اور وہ ہے سورۂ فاتحہ۔

اس سورۂ مبارکہ کی عظمت ایک حدیث رسولؐ سے مزید نکھر کر ہمارے سامنے آتی ہے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں سے حضرت ابی بن کعبؓ کے بارے میں نبی اکرم ﷺ نے فرمایا : "اَقْرَءُھُمْ اُبَیُّ بْنُ کَعْب" یعنی "صحابہؓ میں قرآن کے سب سے بڑے قاری (عالم) اُبَیّ ابن کعب ہیں"۔ ان سے ایک بار خود نبی اکرم ﷺ نے سوال کیا کہ "اے اُبَیّ! کیا میں تمہیں وہ سورت تلقین کروں جس کی مثل نہ تورات میں نازل ہوئی' نہ انجیل میں اور نہ ہی قرآن مجید میں!" جواب میں حضرت ابی ابن کعبؓ نے سراپا اشتیاق بن کر عرض کیا : "حضورؐ ضرور فرمائیے"۔ اس پر نبی اکرم ﷺ نے دوسرا سوال کیا : "تم نماز میں کیا پڑھتے ہو؟" حضرت اُبَیؓ نے جواب میں سورۂ فاتحہ کی تلاوت شروع کر دی تو نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ "یہی ہے وہ سورت جس کی مثل نہ تورات میں نازل ہوئی' نہ انجیل میں اور نہ ہی قرآن میں اس کی مثل و نظیر موجود ہے اور یہی "سَبْعًا مِنَ الْمَثَانِی" اور قرآن عظیم ہے!"

سورۃ الفاتحہ کے عظیم نام

تیسری بات اس سورۂ مبارکہ کے ناموں سے متعلق ہے۔ اس کا سب سے زیادہ مشہور و معروف اور زبان زد خاص و عام نام "الفاتحہ" ہے جو "ف ت ح" مادہ سے بنا ہے۔ "فَتَحَ - یَفْتَحُ" کے معنی ہیں کسی چیز کو کھولنا۔ لہٰذا "الفاتحہ" کے معنی ہوئے "قرآن مجید کی افتتاحی سورت"۔ یہ نام گویا اس اعتبار سے ہے کہ یہ مصحف کی پہلی سورۃ

ہے۔ سب جانتے ہیں کہ عربوں کا یہ خاص مزاج ہے کہ جس چیز سے انہیں خصوصی محبت ہوتی ہے وہ اس کے نام کثرت سے رکھتے ہیں۔ چنانچہ اس سورۂ مبارکہ کے بھی بے شمار نام ملیں گے۔ اس کی عظمت کے اعتبار سے اسے "اُمّ القرآن" اور "اساس القرآن" بھی کہا گیا ہے۔ گویا یہ سورۂ مبارکہ قرآن مجید کے لئے جڑ' بنیاد اور اساس کے مرتبے اور مقام کی حامل سورۃ ہے۔ سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع کے درس میں بیان کیا گیا تھا کہ قرآن حکیم کی ایک اپنی حکمت اور اس کا ایک اپنا جداگانہ فلسفہ ہے۔ چنانچہ حکمتِ قرآنی کے لُبِّ لباب' اس کے جوہر' اس کے خلاصے اور قرآن حکیم کے طرزِ استدلال کے اعتبار سے بھی اس سورۂ مبارکہ کو اساسی اہمیت حاصل ہے۔ اس سورۂ مبارکہ کو "الکافیہ" کا نام بھی دیا گیا ہے یعنی یہ انسان کی فکری رہنمائی کے لئے کفایت کرنے والی سورت ہے۔ اس سورۂ مبارکہ کو "الشافیہ" کے نام سے بھی موسوم کیا گیا ہے یعنی اس میں شفاء ہے۔

یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہئے کہ اللہ تعالیٰ نے پورے قرآن مجید کو بھی "شفاء" قرار دیا ہے' چنانچہ سورۂ یونس کی آیت ۵۷ میں فرمایا گیا :

﴿ یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ وَهُدًی وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ ۝ ﴾

"اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے نصیحت آگئی ہے' اور شفاء بھی دلوں کے امراض کے لئے اور رہنمائی اور رحمت ان کے لئے جو اس پر ایمان لے آئیں۔"

سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۸۲ میں فرمایا گیا :

﴿ وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ ۝ ﴾

"اور ہم اتارتے ہیں قرآن میں سے جس سے روگ دفع ہوں اور رحمت ایمان والوں کے واسطے۔"

یہاں جس شفاء کا تذکرہ ہے اس کے متعلق یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اس سے ذہنی و فکری شفاء اور دل کے روگ جیسے حسد' کینہ' بغض' تکبر وغیرہ باطنی امراض مراد ہیں۔ گویا انسان کی سوچ کو درست کرنے والی کتاب' کتابِ الٰہی ہے اور باطن کے امراض کا مداوا بھی

قرآن حکیم ہے۔ اس موقع پر ساتھ ہی یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ انسان کے جسم اور ذہن میں بہت گہرا ربط ہے۔ ذہن و فکر مریض ہوں تو جسم پر بھی اس کے آثار ظاہر ہوں گے۔ قارئین کے علم میں ہو گا کہ آج کل کے دور میں امراض ذہنی و نفسیاتی کا بڑا چرچا ہے۔ یہ دراصل فسادِ فکری کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ لہٰذا اگر فکر صحیح ہو گی' سوچ درست ہو گی تو لازماً انسان کو جسمانی تندرستی بھی حاصل ہو گی۔ ان اعتبارات سے پورا قرآن مجید بھی شفاء ہے اور یہ سورۂ مبارکہ بھی' کیونکہ یہ پورے قرآن کے خلاصے کی حامل سورت ہے۔ اس میں مومنوں کے لئے ہدایت کے ساتھ ذہنی' فکری اور قلبی شفاء بھی موجود ہے۔ مزید برآں یہ کلام اللہ ہے' اس پر کامل و اکمل یقین رکھنے والوں کے لئے اس میں جسمانی طور پر شفاء ہونا بھی مستبعد نہیں۔ سورۂ فاتحہ کے جسمانی شفاء ہونے کا احادیث صحیحہ میں ذکر ملتا ہے۔

سورۃ الفاتحہ کا اسلوب اور انداز

چوتھی بات اس سورۂ مبارکہ کے اسلوب سے متعلق ہے۔ اگرچہ یہ کلامِ الٰہی ہے لیکن اس کا اسلوب دعائیہ ہے۔ گویا بندوں کو تلقین کی جا رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہونا چاہو تو اس طور سے ہو۔ مزید گہرائی میں اتر کر غور کریں تو درحقیقت انسان کی فطرت سلیمہ کی ترجمانی ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس سورۃ کے جامع الفاظ کی شکل میں فرمائی ہے۔ گویا یہ سورۂ مبارکہ ترانہ شکر و سپاس اور حمد و ثناء بھی ہے' اس میں اللہ کی ربوبیتِ کاملہ اور اس کے مالکِ ارض و سماء ہونے کا اقرار بھی ہے' اس کے رحمٰن اور رحیم ہونے کا یقین بھی ہے اور اس کے جزا و سزا کے دن کا مالک و مختار کل' نیز اس کے عادل و منصف اور قادر مطلق ہونے کا ایقان بھی ہے۔ پھر اس میں صرف اسی کی بندگی و پرستش اور صرف اسی سے مدد و اعانت طلب کرنے کا قول و قرار اور عہد و میثاق بھی ہے۔ مزید برآں اس میں اسی سے صراط مستقیم پر گامزن کرنے اور منزل تک پہنچانے کی توفیق طلبی بھی ہے۔ چنانچہ اس میں اللہ تعالیٰ سے ان لوگوں کی راہ پر چلانے کی دعا بھی ہے جو نہ مغضوب ہوئے اور نہ گمراہ' بلکہ ان کا شمار اللہ تبارک و تعالیٰ کے محبوب اور انعام یافتہ بندوں میں ہوا۔

گویا اس سورۂ مبارکہ کو اس طرح قرآن مجید کے لئے ایک دیباچہ بنا دیا گیا اور بقیہ

پورے قرآن مجید سے اس کا تعلق یہ ہوا کہ یہ تو ہے انسان کی فطرتِ سلیمہ کی پکار' اور اس کا جواب وہ ہے جو قرآن آگے پیش کر رہا ہے۔ انسان کی فطرت میں جس ہدایت اور سیدھے راستے کی طلب ہے وہ "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" کی دعا کی شکل میں سامنے آتی ہے۔ اس طلب اور دعائے ہدایت کا جواب ہے یہ پورا قرآن' جو محمدؐ رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ سورۂ بقرہ کا آغاز ان الفاظ مبارکہ سے ہوتا ہے کہ : ﴿الٓمّٓ ۝ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝﴾ "الٓمّٓ' یہ کتابِ الٰہی ہے۔ اس میں کوئی شک و شبہ کی بات نہیں' یہ خدا ترس لوگوں کے لئے ہدایت بن کر نازل ہوئی ہے" اس طرح ایک طرف یہ سورۂ مبارکہ فلسفہ و حکمت کے اعتبار سے فطرتِ انسانی کی ترجمانی پر مشتمل ہے اور دوسری طرف قرآن مجید کے ساتھ اس کا ربط و تعلق تقریباً وہی ہے جو کسی کتاب کے مقدمے یا دیباچے کا اصل کتاب کے ساتھ ہوتا ہے۔

نماز کا جزوِ لازم

پانچویں بات بہت اہم ہے۔ یقیناً یہ بات تمام قارئین کرام کے علم میں ہوگی کہ یہ سورۂ مبارکہ ہماری نماز کا جزوِ لاینفک ہے۔ نماز کی ہر رکعت میں اس کی تلاوت کی جاتی ہے۔ نبی اکرم ﷺ کی مشہور حدیث ہے' جو متفق علیہ ہے' یعنی جس کو امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ نے اپنی اپنی جامع صحیح میں روایت کیا ہے کہ "لَا صلاةَ لِمَن لَم يَقرأ بفاتحةِ الكتاب" یعنی "اس شخص کی کوئی نماز نہیں جس نے سورۂ فاتحہ نہیں پڑھی"۔ ایک اور حدیثِ قدسی ہے جس کے راوی حضرت ابو ہریرہؓ ہیں اور امام مسلم اسے اپنی صحیح میں لائے ہیں۔ حدیث طویل ہے جس پر ان شاء اللہ آگے گفتگو ہوگی۔ اس سے یہ بات واضح ہو کر سامنے آجائے گی کہ اصل نماز سورۂ فاتحہ ہی ہے۔ اس معاملے میں کسی بھی فقہی مسلک میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ سورۂ فاتحہ ہماری نماز کا جزو لازم ہے۔

البتہ اس معاملے میں جو اختلاف ہے اسے چھٹی بات کے طور پر نوٹ کر لیجئے۔ یہ بات بھی یقیناً آپ کے علم میں ہوگی کہ ہمارے یہاں بعض بڑے جلیل القدر ائمہ دین اور فقہائے کرامؒ کے مابین بعض مسائل میں کچھ اختلافات قدیم زمانے سے چلے آرہے ہیں'

ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جب کوئی شخص امام کے پیچھے باجماعت نماز پڑھ رہا ہو تو اس صورت میں اسے امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھنی چاہئے یا نہیں! ایک رائے یہ ہے کہ یہ سورۃ تو ہر شکل میں پڑھنی ہے' جہری رکعات میں بھی پڑھنی ہے اور سِرّی رکعات میں بھی۔ دوسری رائے اس کے بالکل برعکس ہے۔ وہ یہ کہ جب جماعت کے ساتھ نماز پڑھی جائے تو امام سورۂ فاتحہ پڑھے لیکن مقتدی قطعاً نہ پڑھیں' نہ جہری رکعات میں نہ سِرّی رکعات میں۔ امام ہی کی قراءت مقتدیوں کی طرف سے سورۂ فاتحہ کی قراءت شمار ہو جائے گی۔ جیسے ایک وفد کسی دربار میں حاضر ہوتا ہے تو اس وفد کا قائد یا ترجمان جو بات کرتا ہے وہ سب کی طرف سے شمار ہوتی ہے۔ ایک بین بین کی رائے بھی ہے' وہ یہ ہے کہ اگر جہری رکعت ہے تو امام بلند آواز سے سورۂ فاتحہ کی قراءت کرے گا اور مقتدی سنیں گے اور اگر سِرّی رکعت ہے تو امام بھی خاموشی سے قراءت کرے گا اور مقتدی بھی اس کے پیچھے خاموشی سے پڑھیں گے۔ ان آراء کے حاملین کے اپنے اپنے مسلک اور موقف کے لئے نہایت مضبوط اور مبسوط دلائل موجود ہیں۔

اس ضمن میں قارئین کرام کے سامنے جو بات اہمیت اور تاکید کے ساتھ لانی مقصود ہے وہ یہ ہے کہ ان معاملات کے ضمن میں ہمیں اپنے سینوں کو کشادہ رکھنا چاہئے۔ یہ اختلاف خلوص پر مبنی ہے۔ سب صحیح بات تک پہنچنا چاہتے ہیں اور جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے سب کے پاس اپنے اپنے موقف کے دلائل موجود ہیں۔ یہ فروعی اختلافات ہیں۔ دین کی اصل روح سے ان کا کوئی براہ راست تعلق نہیں ہے۔ ہر رائے افضل و مفضول اور راجح و مرجوح کے اصول پر مبنی ہوتی ہے اور ہر رائے میں خطائے اجتہادی کا یکساں احتمال ہوتا ہے' جس کے متعلق اہلسنت کا مجمع علیہ موقف یہ ہے کہ مبنی بر خلوص اجتہاد میں خطا پر بھی اللہ تعالیٰ کے یہاں اجر و ثواب عطا ہو گا اور اگر اجتہاد صحیح ہو تب تو اس پر دہرا اجر ملے گا۔ البتہ اس مسئلے کے ضمن میں خصوصی بات یہ ہے کہ اس میں ہرگز کوئی اختلاف نہیں ہے کہ سورۂ فاتحہ ہماری نماز کا جزو لاینفک ہے۔ جب مسلمان انفرادی طور پر نماز پڑھ رہا ہو تو اسے لازماً ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ پڑھنی ہو گی۔ البتہ جب جماعت میں شامل ہو تو ایک رائے یہ ہے کہ امام کی سورۂ فاتحہ کی قراءت تمام مقتدیوں کی طرف سے بھی کفایت کرے گی۔

دوسری رائے یہ ہے کہ مقتدی کو بھی ہر رکعت میں امام کے پیچھے یہ سورہ پڑھنی ہوگی اور ایک درمیانی رائے یہ ہے کہ مقتدی جہری نماز میں خاموش رہے گا' البتہ سری رکعت میں خود بھی سورۂ فاتحہ پڑھے گا۔

تعدادِ آیات

ساتویں بات اس سورۂ مبارکہ کی آیات سے متعلق ہے۔ یہ چیز متفق علیہ ہے کہ اس سورۃ کی آیات کی تعداد سات ہے۔ جیسا کہ میں نے سورۃ الحجر کی آیت کے حوالے سے عرض کیا تھا کہ تمام مسالک کے نزدیک "سبعًا مِنَ المَثانی" کی مصداق یہ سورۂ مبارکہ ہے۔ لہٰذا آیات کی تعداد سات ہونے میں کوئی اختلاف ممکن نہیں۔ البتہ اس میں ایک اختلاف یہ ہے کہ بعض علمائے کرام "بسم اللہ" کو بھی اس میں شامل کرتے ہیں' جبکہ اکثر علماء "بسم اللہ" کو سورۂ فاتحہ کا جزو نہیں مانتے۔ ان کے نزدیک وہ بالکل علیحدہ ایک مستقل افتتاحی آیت ہے جو سورۂ براءۃ (سورۂ توبہ) کے علاوہ ہر سورۃ کے آغاز میں لکھی جاتی ہے' لیکن اس سورۃ کا جزو نہیں ہوتی۔ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ علماء اور قراء کے مابین خلوص سے بھی اختلاف رائے ہوتا ہے جس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اختلاف کی گنجائش ہوتی ہے۔ اگرچہ وزنی رائے وہی معلوم ہوتی ہے جو امام ابو حنیفہؒ کی ہے کہ اس سورۂ مبارکہ میں "بسم اللہ" شامل نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس رائے کی پشت پر وہ حدیثِ قدسی ہے جس کا قدرے تفصیل سے ذکر آگے آئے گا۔

تین حصّوں پر مشتمل سورۃ

آٹھویں بات یہ ہے کہ اس سورۂ مبارکہ کے تین حصے ہیں اور عجیب بات یہ ہے کہ اگرچہ آیات سات ہیں لیکن نحوی اعتبار اور گرامر کے اصولوں کے لحاظ سے ان سات آیات سے مکمل جملے تین ہی بنتے ہیں۔ پہلی تین آیات "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○ مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ ○" گرامر کی رو سے ایک ہی جملہ ہے اور نحوی اعتبار سے یہ "جملہ اسمیہ خبریہ" ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء اور شکر و سپاس ہے' اس کی صفاتِ رحمانی و رحیمی اور عدل و قسط کا بیان ہے۔ پھر چوتھی

آیت جو اس سورۂ مبارکہ کی مرکزی آیت ہے خود ایک مکمل جملہ ہے' بلکہ اس کے مزید تجزیئے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ایک آیت میں دو مکمل جملے موجود ہیں۔ بہرحال یہ ہے "جملہ فعلیہ خبریہ" ..... یہ مرکزی آیت ہے "اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ" ترجمہ ہے "(اے رب ہمارے!) ہم صرف تیری ہی بندگی و پرستش کرتے ہیں اور کریں گے اور صرف تجھی سے مدد چاہتے ہیں اور چاہیں گے"۔ یہاں حصر کا اسلوب ہے اور عربی میں چونکہ فعل مضارع میں حال اور مستقبل دونوں کے معنی ہوتے ہیں' لہٰذا ان امور کا ترجمہ میں لحاظ رکھا گیا ہے۔ اس آیت میں رب اور بندے کے مابین ایک قول و قرار اور ایک معاہدہ و میثاق ہے۔ یہ مسلّمہ بات ہے کہ معاہدے میں دو فریق منسلک ہوتے ہیں' لہٰذا یہ "جملہ فعلیہ خبریہ" درحقیقت اللہ اور بندے کے درمیان عہد و پیمان ہے۔ تیسرا حصہ جو آخری تین آیات پر مشتمل ہے : "اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ○ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ' غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ ○" یعنی "(اے رب ہمارے!) ہمیں سیدھی راہ کی ہدایت بخش۔ ان لوگوں کی راہ کہ جن پر تو نے انعام فرمایا' جو نہ مغضوب ہوئے اور نہ گمراہ"۔ یہ بھی ایک ہی جملہ بنتا ہے اور نحو کے اعتبار سے یہ "جملہ انشائیہ" ہے۔ یہ ایک دعا ہے۔ اس میں ایک بندہ اپنے رب سے جس کی وہ تحمید و تمجید کر چکا' جس کی ربوبیت' رحمانیت' رحیمیت اور عدالت کا اقرار کر چکا' پھر جس سے وہ عبادت و استقامت کا عہد بھی استوار کر چکا' اب وہ اسی رب سے اپنی فطرت کی پکار اور پیاس کی سیرابی کے لئے "صراطِ مستقیم" یعنی زندگی بسر کرنے کے لئے معتدل و متوازن طرز زندگی اور راہ عمل کی رہنمائی اور توفیق کا طلب گار اور متمنی ہے۔

اس موقع پر نویں اور آخری بات سے قبل وہ حدیثِ قدسی ترجمہ کے ساتھ پیش کرنی مناسب ہے جس کا ذکر پہلے دوبار ہو چکا ہے اور جو امام مسلمؒ نے اپنی صحیح میں روایت کی ہے :

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ إِنِّي سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ قَالَ اللّٰهُ تَعَالَى قَسَمْتُ الصَّلَاةَ بَيْنِي وَبَيْنَ عَبْدِي

نِصْفَيْنِ وَلِعَبْدِي مَا سَأَلَ فَإِذَا قَالَ الْعَبْدُ (الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ) قَالَ اللّٰهُ تَعَالَى حَمِدَنِي عَبْدِي وَإِذَا قَالَ (الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ) قَالَ اللّٰهُ تَعَالَى أَثْنَى عَلَيَّ عَبْدِي وَإِذَا قَالَ (مَالِكِ يَوْمِ الدِّينِ) قَالَ مَجَّدَنِي عَبْدِي وَقَالَ مَرَّةً فَوَّضَ إِلَيَّ عَبْدِي فَإِذَا قَالَ (إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ) قَالَ هَذَا بَيْنِي وَبَيْنَ عَبْدِي وَلِعَبْدِي مَا سَأَلَ فَإِذَا قَالَ (اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ) قَالَ هَذَا لِعَبْدِي وَلِعَبْدِي مَا سَأَلَ (رواہ مسلم)

حضرت ابو ہریرہؓ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

"میں نے نماز کو اپنے اور اپنے بندے کے درمیان دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ اس کا نصف حصہ میرے لئے اور نصف حصہ میرے بندے کے لئے ہے اور میرے بندے کو وہ عطا کیا گیا جو اس نے طلب کیا۔ جب بندہ کہتا ہے "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ" تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے بندے نے میری حمد کی (میرا شکر ادا کیا)۔ جب بندہ کہتا ہے "اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے بندے نے میری ثناء کی۔ جب بندہ کہتا ہے "مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ" تو اللہ فرماتا ہے کہ میرے بندے نے میری بزرگی اور بڑائی بیان کی۔"

گویا یہ پہلا حصہ کل کا کل اللہ کے لئے ہے۔ آگے بڑھنے سے قبل قارئین اس مقام پر یہ بات نوٹ فرمالیں کہ اس حدیث قدسی میں "قَسَمْتُ الصَّلٰوةَ بَيْنِي وَبَيْنَ عَبْدِي نِصْفَيْنِ" کے بعد آیت "بسم اللہ" کا ذکر موجود نہیں بلکہ "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ" سے براہ راست بات آگے بڑھتی ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ آیت بسم اللہ سورۂ فاتحہ میں شامل نہیں ہے۔ اب حدیث کی طرف رجوع فرمائیے :

"جب بندہ کہتا ہے "اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ" تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ حصہ میرے اور میرے بندے کے مابین مشترک ہے اور میں نے اپنے بندے کو بخشا جو اس نے مانگا۔"

گویا یہ حصہ ایک معاہدہ ہے' قول و قرار ہے' عہد و میثاق ہے۔ اس میں بندے نے "اِیَّاکَ نَعْبُدُ" کہہ کر اللہ کی عبادت کا عہد کیا ہے اور "وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ" میں کچھ طلب بھی کیا ہے' مدد بھی چاہی ہے۔ اس کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "یہ میرے بندے کے لئے ہے اور میں نے اپنے بندے کو دیا جو اس نے مجھ سے طلب کیا۔" اب آخری حصہ رہ گیا۔ فرمایا :

"جب بندہ کہتا ہے اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ .....وَلَا الضَّآلِّیْنَ تو اللہ فرماتا ہے کہ یہ حصہ (کُل کا کل) میرے بندے کے لئے ہے اور میرے بندے نے جو کچھ مجھ سے طلب کیا وہ میں نے اسے بخشا۔"

اس حدیث کی رو سے سورۂ فاتحہ کے تین حصے بن جائیں گے۔ پہلا حصہ کلیتاً اللہ کے لئے ہے اور آخری کلیتاً بندے کے لئے جبکہ درمیانی و مرکزی آیت "اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ" بندے اور اللہ کے مابین قول و قرار ہے۔ گویا اس کا بھی نصفِ اول اللہ کے لئے اور نصفِ ثانی بندے کے لئے۔ اس طرح نصف نصف کی تقسیم بہ تمام و کمال پوری ہو گئی!

"آمین" کی حیثیت

اس سورۂ مبارکہ کے بارے میں نویں اور آخری بات یہ ہے کہ اس سورۂ مبارکہ کے اختتام پر "آمین" کہنا مسنون ہے۔ آمین کے معنی ہیں "اے اللہ ایسا ہی ہو۔" یہ ابتدا ہی میں عرض کیا جا چکا ہے کہ اس سورۂ مبارکہ کا اسلوب دعائیہ ہے' لہٰذا دعا کے اختتام پر "آمین" کہہ کر گویا بندہ پھر بارگاہ الٰہی میں عرض کرتا ہے کہ "اے پروردگار! میں نے یہ استدعا اور یہ عرضداشت تیرے حضور پیش کی ہے' تو اسے شرفِ قبول عطا فرما۔ اے پروردگار ایسا ہی ہو۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ سورۂ فاتحہ کی تلاوت کے بعد تمام فقہی مسالک میں آمین کہنے کے مسنون ہونے پر اتفاق ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ امام کے پیچھے جہری رکعت میں آمین اونچی آواز سے کہی جائے یا پست آواز سے تو ان سب آراء رکھنے والوں کے پاس

دلائل موجود ہیں۔ یہ بھی ایک فروعی اختلاف ہے۔ اس میں جو متفقہ بات ہے وہ ہماری رہنمائی کے لئے کفایت کرتی ہے کہ سب کے نزدیک سورۂ فاتحہ کی قراءت کے بعد "آمین" کہنا مسنون ہے۔

ہم نے اس سورۂ مبارکہ کے بارے میں جو چند تمہیدی و بنیادی باتیں سمجھی ہیں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو ہماری نمازوں میں جان' خشوع و خضوع اور حضوری قلب پیدا ہو جانے کا ذریعہ بنادے۔ اور جب ہم اپنی نمازوں میں سورۂ فاتحہ کی قراءت کریں تو اس کے مفہوم کو سمجھ کر ذہنی اور قلبی وابستگی کے ساتھ اس سورۂ مبارکہ کے الفاظ کو اپنی زبان سے ادا کریں۔ اور دل کی گہرائیوں سے اس بات کے آرزومند ہوں کہ اس سورت کے ذریعے جس صراطِ مستقیم کی استدعا کی جاتی ہے' وہ ہمیں بالفعل حاصل ہو جائے اور ہمیں اس پر چلنے کی توفیق کی بھی بارگاہ ربانی سے ارزانی ہو ـــــ آمین!

سورۃ الفاتحہ کا جزو اول

سورۂ فاتحہ کے سلیس و رواں ترجمے' اس کے بارے میں چند تمہیدی باتوں اور اس کے مضامین کے اجمالی تجزیئے کے بعد اب ہم اس سورۂ مبارکہ کے تینوں حصوں کو علیحدہ علیحدہ قدرے گہرائی میں اتر کر سمجھنے کی کوشش کریں گے۔ جیسے کہ اس سے قبل بیان کیا جاچکا ہے اس سورۂ مبارکہ کا جزو اول تین آیات پر مشتمل ہے :

﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ○ ﴾

"کل شکر اور کل ثنا اللہ کے لئے ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار اور مالک ہے۔ بہت رحم فرمانے والا' نہایت مہربان' جزا و سزا کے دن کا مالک و مختار ہے"۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ

نوٹ کیجئے کہ یہ سورۂ مبارکہ قرآن مجید کی افتتاحی سورۃ ہے اور اس کا ابتدائی کلمہ

ہے "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ"۔ یہ کلمہ طیبہ نہایت عظیم اور بہت بلند مرتبت ہے۔ اس کے مفہوم کو سمجھنے کے لئے سب سے پہلے لفظ "حمد" کو اچھی طرح جان لینا ضروری ہے۔ عام طور پر اس کا ترجمہ صرف ایک لفظ "تعریف" سے کر دیا جاتا ہے' حالانکہ تعریف بھی عربی کا لفظ ہے اور حمد بھی عربی کا لفظ ہے۔ اور یہ قاعدہ کلیہ ہے کہ کسی زبان کے دو الفاظ بالکل ہم معنی نہیں ہوتے' ان کے معنی و مفہوم میں لازماً کچھ نہ کچھ فرق ضرور ہوتا ہے۔ اگر گہرائی میں اتر کر دیکھا جائے تو لفظ "حمد" میں دو مفہوم شامل ہیں' ایک شکر اور دوسرا ثناء۔ شکر کا لفظ سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع کے ضمن میں تفصیلاً زیر بحث آ چکا ہے۔ وہاں واضح کیا جا چکا ہے کہ اگر فطرت اپنی صحت پر برقرار ہو تو اس کا تقاضا جذبۂ تشکر ہے اور اگر عقل صحیح نہج پر کام کر رہی ہو تو اس کا حاصل اپنے منعمِ حقیقی اور اپنے اصل مربی و محسن یعنی اللہ کو پہچان لینا ہے۔ فطرت سلیمہ اور عقل صحیحہ دونوں کے امتزاج سے جو چیز حاصل ہوتی ہے اس کا نام "حکمت" ہے۔ لہٰذا حکمت کا لازمی تقاضا اللہ کا شکر ہے۔ یہی بات اس سورۂ مبارکہ کے ابتدائی کلمات میں آئی ہے کہ "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ" لیکن حمد کا لفظ شکر سے زیادہ وسیع تر مفہوم کا حامل ہے۔ کسی کا شکر ایسی چیز پر ادا کیا جاتا ہے جس کا کوئی فائدہ شکر کرنے والے کی ذات کو پہنچ رہا ہو۔ لیکن ثنا اور تعریف کی جاتی ہے کسی بھی حسن و جمال یا کمال کی خواہ اس کا ہمیں کوئی فائدہ پہنچا ہو یا نہ پہنچا ہو۔ حمد کے لفظ میں یہ دونوں چیزیں جمع ہیں' یعنی شکر بھی اور ثناء بھی۔ لہٰذا ہم نے ترجمہ میں ان دونوں کو جمع کر دیا ہے کہ "کُل شکر اور کُل ثناء اللہ کے لئے ہے۔"

ایک دوسرے پہلو سے غور کیجئے تو آپ اس نتیجے سے اتفاق کریں گے کہ یہ کلمۂ توحید ہے۔ ہم یہ بات جانتے ہیں کہ اس کائنات میں جہاں کہیں بھی کوئی مظہرِ حسن ہے' مظہرِ کمال ہے' مظہرِ جمال ہے ان کے متعلق ہماری عقل صحیحہ یہ رہنمائی کرتی ہے کہ ان تمام محاسن و کمالات کا منبع اور سرچشمہ صرف اللہ تبارک و تعالیٰ کی ذات اقدس ہے۔ لہٰذا اصل تعریف اور ثناء ان اشیاء کی نہیں ہوتی بلکہ اللہ کی ہوتی ہے۔ کلمہ توحید کا اقتضاء یہی ہے کہ موحد کے شعور اور تحت الشعور سب میں یہ بات مستحضر رہے کہ کائنات کی ہر نعمت' ہر چیز' ہر حسن' ہر جمال اور ہر کمال الغرض کوئی وصف کسی کا ذاتی نہیں بلکہ اللہ کا ودیعت کردہ ہے۔

جیسے تصویر میں اگر کوئی حسن ہے تو وہ درحقیقت مصور کے کمالِ فن کی عکاسی ہے۔ تصویر کا اپنا کوئی حسن نہیں' نہ اس کا کوئی اپنا ذاتی کمال ہے۔ بالکل اسی طرح کسی مخلوق میں اگر کوئی حسن اور کمال ہے یا کوئی خوبی اور جمال ہے تو وہ حسن و کمال اور خوبی و جمال خالق کا ہے' نہ کہ مخلوق کا۔ چنانچہ اس کُل سلسلۂ کون و مکان میں جہاں کوئی حسن' کوئی کمال' کوئی خیر' کوئی خوبی اور کوئی جمال ہے یا کسی شے میں کوئی نفع رسانی کا پہلو ہے تو اس کا منبع و سرچشمہ ذاتِ باری تعالیٰ ہے۔ لہٰذا شکر کا سزاوارِ حقیقی اور تعریف و ثناء کا اصل مستحق اللہ تعالیٰ ہے۔

یہ کلمہ "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ" اتنا عظیم اور اعلیٰ مرتبت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ یہ کلمہ آسمان و زمین کو اپنی برکات سے بھر دیتا ہے۔ فرمان نبویؐ ہے: "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ تَمْلَأُ الْمِیزَانَ' وَسُبْحَانَ اللّٰہِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ تَمْلَآنِ [أَوْ تَمْلَأُ] مَا بَیْنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ"۔ (مسلم) "کلمہ سبحان اللہ میزان کو نصف بھر دیتا ہے اور جب ایک انسان ساتھ ہی الحمد للہ کہتا ہے تو یہ کلمہ نہ صرف میزان کو پُر کر دیتا ہے بلکہ آسمان و زمین کے مابین جو خلا ہے' جو فضا ہے اس سب کو پر کر دیتا ہے"۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کے انعام و اکرام اور احسانات کے ضمن میں انبیاء و رسل علیہم السلام اور صالحین کے جو کلماتِ شکر منقول ہوئے ہیں اور اس سلسلے میں نبی اکرم ﷺ نے جن دعاؤں کی تعلیم و تلقین فرمائی ہے ان میں سے اکثر و بیشتر میں یہ کلمہ "الحمد للہ" استعمال ہوا ہے۔ طوالت سے بچنے کی خاطر دو مثالیں قرآن مجید اور دو مثالیں حدیث شریف سے پیش کرنے پر اکتفا کرنی ہوگی۔ سورۂ ابراہیم میں وارد ہے کہ جب بڑھاپے میں اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حضرت اسمٰعیلؑ اور حضرت اسحٰقؑ جیسے صالح فرزند عطا فرمائے جو آگے چل کر منصبِ نبوت پر بھی سرفراز ہوئے تو اس احسان و انعام و نعمت اور کرم پر حضرت ابراہیمؑ کی زبان پر ترانہ شکر جاری ہوا کہ "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ وَھَبَ لِیْ عَلَی الْکِبَرِ اِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ' اِنَّ رَبِّیْ لَسَمِیْعُ الدُّعَآءِ" (آیت ۳۹) یعنی "کُل شکر اور ثنا اللہ کے لئے ہے جس نے مجھے بڑھاپے کے باوجود اسمٰعیلؑ اور اسحٰقؑ عطا فرمائے۔ یقیناً میرا رب دعا کا سننے (اور قبول کرنے) والا ہے"۔ ایک اور مثال سورۂ اعراف سے دیکھ لیجئے۔ جب مومنین صادقین کو حساب کتاب

کے بعد جنت میں داخلے کا اذن ملے گا تو ان کی زبانوں پر کلمۂ شکر و سپاس اور تعریف و ثنا ان الفاظ میں جاری ہو گا کہ "وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِی هَدَانَا لِهٰذَا وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِیَ لَوْلَا اَنْ هَدَانَا اللّٰهُ" (آیت ۴۳) "اور وہ کہیں گے کل شکر اور کل ثناء اس اللہ کی ہے جس نے ہمیں اس کی ہدایت فرمائی (بلکہ یہاں تک پہنچا دیا) اور ہم خود ہدایت نہ پا سکتے (اور یہاں تک ہرگز نہ پہنچ پاتے) اگر اللہ ہی ہماری رہنمائی نہ فرماتا"۔ رسول ﷺ نے سو کر اٹھنے کی یہ دعا تلقین فرمائی کہ "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِی اَحْیَانَا بَعْدَ مَا اَمَاتَنَا وَاِلَیْهِ النُّشُوْرِ" یعنی "کل شکر و ثناء اللہ کی ہے جس نے ہمیں زندہ کیا اس کے بعد کہ ہم پر موت طاری کر دی تھی اور (ایک دن اسی طرح) اس کی جانب لوٹ جانا ہے" اور اکل و شرب کے بعد کی دعا ان الفاظ میں تلقین فرمائی "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِی اَطْعَمَنَا وَسَقَانَا وَجَعَلَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ" یعنی "کل شکر اور ثناء اس اللہ کے لئے ہے جس نے ہمیں کھلایا اور پلایا اور ہمیں مسلمانوں میں شامل فرمایا"۔

رَبِّ الْعَالَمِیْن

اب آگے باری تعالیٰ کی چند مزید صفات کمال کا ذکر ہو رہا ہے۔ پہلی بات سامنے آتی ہے۔ "رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ" جو تمام جہانوں کا مالک اور پروردگار ہے"۔ "رب" کے لفظ میں یہ دونوں مفہوم شامل ہیں۔ عرب گھر کے مالک کو ربّ البَیت یا ربّ الدّار کہتے ہیں۔ قرآن مجید میں رب کا لفظ مالک کے معنوں میں متعدد مقامات پر استعمال ہوا ہے۔ جیسے سورۂ قریش میں آتا ہے: "فَلْیَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَیْتِ" یعنی "پس عبادت کرو اس گھر (حرم شریف) کے مالک کی"۔ پھر رب کا مفہوم پرورش کرنا' ترقی اور نشوونما دینا بھی ہے۔ ایک مالک ایسا نااہل اور ناکارہ بھی ہو سکتا ہے جو اپنی ملکیت کو لے کر بیٹھ رہے۔ اس کی ترقی اور نشوونما کی اسے کوئی خاص پرواہ نہ ہو اور ایک مالک ایسا قابل و قادر ہوتا ہے کہ اس کی ملکیت میں جو چیزیں ہیں وہ ان میں سے ہر چیز کو اس کی استعدادات کے مطابق پروان چڑھائے اور ہر شے کو اس کے نقطۂ کمال تک پہنچانے کا سامان فراہم کرے۔ پس اللہ کی ذات گرامی وہ ہے جو ہر شے کے نقطۂ عروج و کمال تک پہنچنے کے جملہ مقتضیات کو فراہم

کرنے اور بہم پہنچانے والی ہے۔ "عَالَمِین" عالَم کی جمع ہے۔ لہٰذا یہاں رب العالمین کا مفہوم ہو گا سارے جہانوں کی مخلوقات کا مالک اور پروردگار اللہ ہی ہے۔ آقا بھی وہی ہے اور پرورش کنندہ بھی وہی ہے۔

الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم

اگلی آیت میں اللہ تبارک و تعالیٰ کا ایک اور وصف "الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم" کے الفاظ میں بیان ہوا۔ یہ اللہ سبحانہ کے دو بڑے عظیم صفاتی نام ہیں۔ دونوں کا مادہ رحمت ہے۔ اسی رحمت سے "رحمٰن" اور اسی سے "رحیم" بنا۔ ان دونوں کے فرق کو اچھی طرح سمجھنے کی ضرورت ہے۔ عربی زبان میں "فَعلانُ" کے وزن پر جب کوئی صفت آتی ہے تو اس میں ایسا نقشہ سامنے آتا ہے جیسے کسی شے میں جوش و خروش اور طوفانی اور ہیجانی کیفیت ہو۔ خود ہیجان بھی فَعلان کے وزن ہی پر ہے۔ تشبیہ کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ جیسے سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہو' اس میں زبردست ہلچل ہو۔ کسی صفت کی یہ کیفیت ہو تو عربی میں اسے اکثر فَعلان کے وزن پر لایا جاتا ہے۔ مثلاً جب کہا جائے "اَنَا عَطشَان" تو مفہوم ہو گا "میں شدید پیاسا ہوں یا پیاس سے مرا جا رہا ہوں"۔ "اَنَا جَوعَان" "میں بہت بھوکا ہوں یا بھوک سے میری جان نکل رہی ہے"۔ "هُوَ غَضْبَان" "وہ نہایت غصے اور طیش میں ہے"۔ ان امور کو سامنے رکھئے اور اب رحمٰن کے لفظ کو سمجھئے کہ اس کے معنی کیا ہوں گے! رحمٰن وہ ہستی ہے جس کی رحمت ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کے مانند ہے۔ جس کی رحمت میں انتہائی جوش و خروش ہے۔

البتہ "فعیل" کے وزن پر جب کوئی صفت آتی ہے تو اس صفت میں اس کے دوام و استمرار کا مفہوم شامل ہوتا ہے۔ یعنی یہ وقتی جوش و خروش نہیں ہے بلکہ اس میں پائیداری و استواری اور مستقل مزاجی ہے۔ گویا اللہ کی رحمت کی شان یہ بھی ہے کہ اس میں دوام اور استمرار ہے جیسے ایک دریا ہموار ی کے ساتھ مسلسل بہہ رہا ہے' اس میں ہیجان نہیں ہے۔ سمندر کی طرح کا جوش و خروش نہیں ہے۔ لیکن بہاؤ کا ایک خاموش اور پُرسکون تسلسل ہے۔ پس اللہ تعالیٰ کی یہ دونوں شانیں ہیں جو اس سورۂ مبارکہ میں بیک وقت

موجود ہیں۔ یعنی وہ بیک وقت رحمٰن بھی ہے' رحیم بھی ہے۔ اس بات کو ایک تشبیہ سے مزید سمجھا جاسکتا ہے۔ فرض کیجئے کہ سڑک پر کوئی حادثہ ہو گیا ہو جس میں کئی افراد ہلاک ہو گئے ہیں اور فرض کیجئے کہ اس حادثے میں ایک ایسی عورت بھی ہلاک ہو گئی جس کی گود میں ایک دودھ پیتا بچہ بھی تھا۔ وہ بچہ زندہ ہے اور اپنی مردہ ماں کی چھاتی سے چمٹا ہوا ہے۔ یہ کیفیت دیکھ کر کون انسان ہو گا جس کے دل میں رقت پیدا نہ ہو اور شفقت و رحمت کے جذبات موجزن نہ ہو جائیں۔ ہر انسان یہ چاہے گا کہ یہ بچہ جو بے سہارا ہو گیا ہے' میں اس کی کفالت اپنے ذمہ لے لوں' اس کی پرورش میں کروں۔ لیکن اگر وہ اس جوش میں یہ ذمہ داری لے بیٹھا' تو ہمارا مشاہدہ یہ ہے کہ اکثر و بیشتر یہ وقتی جوش بہت جلد ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ دنوں ہی کے بعد اسے محسوس ہو کہ میں یہ کیا غلطی کر بیٹھا! میرے اپنے بچے ہیں' میری بے شمار ذمہ داریاں پہلے سے موجود تھیں' اب ان پر مستزاد یہ بوجھ میں نے خواہ مخواہ اپنے سر لے لیا۔ گویا وقتی طور پر وہ ہیجانی کیفیت جو اس کے دل میں پیدا ہوئی تھی جس کے زیر اثر اس نے بے سہارا بچے کی کفالت کی ذمہ داری لے لی تھی' اس میں دوام و استمرار نہیں تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی رحمت کی یہ دونوں شانیں بیک وقت ہیں۔ وہ بیک وقت رحمٰن بھی ہے اور رحیم بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ "الرَّحْمٰنِ الرَّحِیم" کے مابین حرفِ عطف "و" نہیں آیا بلکہ یہاں فرمایا "الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ" یعنی اس میں یہ دونوں صفات' یہ دونوں شانیں بیک وقت بہ تمام و کمال موجود ہیں۔

ایک اعتراض اور اس کا جواب

اب ذرا اس بات پر غور کیجئے کہ یہ سورۂ فاتحہ یعنی قرآن مجید کی بالکل ابتدائی سورۃ کی پہلی دو آیات ہیں اور ان میں اللہ تعالیٰ کا جو تعارف ہمارے سامنے آتا ہے اس میں کون سی چیز غالب ہے؟ وہ ہے اس کی ذات کا لائقِ حمد و ثناء اور قابلِ شکر و امتنان ہونا اور اس کی ربوبیتِ عامہ اور اس کی رحمتِ تامہ! یہ ہے اللہ سبحانہ کا ابتدائی تعارف جو قرآن نوع انسانی سے کراتا ہے۔ یہاں اس اعتراض کو بھی پیش نظر رکھ لیجئے جو بعض مستشرقین اور ان کی تقلید میں اکثر آریہ سماجیوں نے قرآن مجید اور اسلام پر کیا ہے' پھر اس اعتراض کے صحیح

جواب کو بھی جان لیجئے۔ وہ کہتے ہیں کہ قرآن میں اللہ کے خوف پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے اور اسی کو زیادہ نمایاں کیا گیا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں خوف' تقویٰ' میدان حشر کے مصائب' جہنم کے عذاب اور اس کی روح فرسا تفصیلات کی بہت تکرار رہے' جبکہ ہمارے مذہب میں اللہ کی محبت اور اس کے شفیق و رحیم ہونے پر بہت زور ہے۔ یہ درحقیقت قرآن مجید پر بہتان ہے' اس لئے کہ قرآن مجید بالکل افتتاحی سورۃ میں اللہ تبارک و تعالیٰ کا جو ابتدائی تعارف کرا رہا ہے وہ معاذ اللہ ثم معاذ' اللہ کسی خوفناک ہستی کا تعارف نہیں ہے بلکہ ایک پروردگار اور پالن ہار' ایک سراپا رحمت و شفقت ذات' ایک شفیق اور ودود ہستی اور ایک رحمٰن و رحیم آقا کا تعارف کرا رہا ہے جو تمام صفاتِ کمال سے متّصف ہے اور جس کی ذاتِ اقدس میں تمام محاسن موجود ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ اس کا اصل اور حقیقی تعارف تو یہ ہے جو سورۂ فاتحہ کی ان دو آیات میں بیان ہوا۔ البتہ یہ بات اپنی جگہ ایک حقیقت ہے کہ سب لوگ محبت کے رمز آشنا اور قدر شناس نہیں ہوتے' اکثر لوگ پست ذہنی سطح ہی کے حامل ہوتے ہیں' جن کے بارے میں علامہ اقبال مرحوم نے کہا ہے ؎

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر

ایسے لوگوں کے لئے ضرورت ہے کہ انہیں خوف بھی دلایا جائے' ان کے دلوں میں بازپرس کا احساس بھی اجاگر کیا جائے' ان کو عذابِ الٰہی سے خبردار بھی کیا جائے اور برے کاموں کی سخت سزا سے ڈرایا بھی جائے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں دونوں چیزیں یعنی اللہ تعالیٰ کے غفور' ستار' رحیم' رحمٰن' رؤف' ودود ہونے کی شانیں بھی ملیں گی اور قہار' ذوانتقام' سریع الحساب ہونے کا ذکر بھی ملے گا۔

ابتداء میں نبی اکرم ﷺ کو جو احکام ملے ہیں ان میں آپؐ کو اس طرح مخاطب کیا گیا ہے : یٰٓاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝ قُمْ فَاَنْذِرْ ۝ "اے لحاف میں لپٹ کر لیٹنے والے (صلی اللہ علیہ وسلم) کھڑے ہو جاؤ (کمربستہ ہو جاؤ) اور لوگوں کو خبردار کرو"۔ ایک اور جگہ فرمایا : وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ۝ "اور (اے نبی) اپنے رشتہ داروں اور قریبی اعزہ کو خبردار کیجئے"۔ تو ابتداء میں انذار کا پہلو ضرور غالب رہا لیکن اصولاً قرآن مجید

جس اللہ پر ایمان کی دعوت دیتا ہے وہ معاذ اللہ کوئی خوفناک ہستی نہیں بلکہ محبت کرنے والی اور محبت ہی نہیں پرستش کرنے کے لائق ہستی ہے' اس سے محبت کرو' اسے چاہو' اس سے لو لگاؤ' جیسے کہ سورۂ بقرہ میں ارشاد ہوا : "وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ" (آیت ۱۶۵) "جو واقعتاً صاحب ایمان ہیں وہ تو سب سے زیادہ شدید محبت اللہ تعالیٰ کے ساتھ کرتے ہیں"۔ اور اس محبت کی اساسات ہیں جو سورۂ فاتحہ کی ابتدائی دو آیات میں ہمارے سامنے آئیں کہ اللہ تعالیٰ تمام محاسن و کمالات کا جامع ہے' منبع و سرچشمہ ہے' وہ کائنات کا رب ہے' مالک ہے' پروردگار ہے' پالن ہار ہے' وہ الرحمٰن الرحیم ہے۔ اس کی رحمت ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کے مانند بھی ہے اور استمرار اور دوام کے ساتھ بہنے والے دریا کے مانند بھی ہے۔

مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ

تیسری آیت میں دوسرا رخ آ رہا ہے جس کا ذکر اوپر ہو چکا' یعنی انذار۔ فرمایا : "مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ" زندگی محض اس دنیا کی زندگی تک محدود نہیں ہے بلکہ یہ زندگی ایک امتحان گاہ ہے' جس میں آزمائش ہوتی ہے کہ انسان کس طرح زندگی بسر کرتا ہے' جیسے سورۂ ملک میں فرمایا : "خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا" (آیت ۲) "موت اور زندگی کو اللہ نے پیدا ہی اس لئے کیا ہے کہ تم کو آزمائے اور دیکھے کہ تم میں کون بہتر عمل کرنے والا ہے"۔ لہٰذا اس آزمائش اور امتحان کا لازمی تقاضا ہے کہ جزا و سزا کا ایک دن بھی ہو۔ اور وہ دن آ کر رہے گا جس دن لوگوں کو اپنے اعمال کا پورا پورا بدلہ ملے گا' ہر انسان کا محاسبہ ہو گا اور اسے جواب دہی کرنی ہو گی۔ اس محاسبہ اور حساب کتاب کے نتیجے میں جزا یا سزا کے فیصلے صادر ہوں گے۔ یہ ہو گا "یوم الدین" جس کے متعلق ہم آیۂ برکے درس میں پڑھ چکے ہیں' اس کے بارے میں سورۃ الذاریات میں فرمایا گیا : "اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ ۝ وَّاِنَّ الدِّیْنَ لَوَاقِعٌ ۝" (آیات ۵'۶) "جو وعدہ تم سے کیا جا رہا ہے وہ سچا ہے اور جزا و سزا واقع ہو کر رہے گی"۔ اس محاسبہ کے نتیجے میں یا جنت ہو گی ہمیشہ کے لئے یا آگ ہو گی دائمی' جیسا کہ نبی اکرم

ﷺ کے ابتدائی خطبات میں سے ایک خطبہ کے آخر میں آتا ہے :

وَاللّٰہِ لَتَمُوتُنَّ کَمَا تَنَامُونَ ' ثُمَّ لَتُبْعَثُنَّ کَمَا تَسْتَیْقِظُونَ ' ثُمَّ لَتُحَاسَبُنَّ بِمَا تَعْمَلُونَ ' ثُمَّ لَتُجْزَوُنَّ بِالْاِحْسَانِ اِحْسَانًا وَبِالسُّوْءِ سُوْءً ' وَاِنَّھَا لَجَنَّۃٌ اَبَدًا اَوْلَنَارٌ اَبَدًا

"اللہ کی قسم تم سب (ایک دن) مرجاؤ گے جیسے (روزانہ) سو جاتے ہو! پھر یقیناً اٹھائے جاؤ گے جیسے (ہر صبح) بیدار ہو جاتے ہو۔ پھر لازماً تمہارے اعمال کا حساب کتاب ہو گا' پھر لازماً تمہیں بدلہ ملے گا اچھائی کا اچھا اور برائی کا برا (اور یہ اس شکل میں ہو گا کہ) وہ جنت ہے ہمیشہ کے لئے یا آگ ہے دائمی"۔

اس فیصلے اور جزا و سزا کے دن کا مالک و مختار صرف اللہ ہے۔ "مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ" ـــــ اور اس روز اللہ کے سوا کسی کے پاس کوئی اختیار نہیں ہو گا۔ چنانچہ ایک جگہ قرآن مجید میں الفاظ آئے ہیں کہ اس روز ایک ندا ہو گی : "لِمَنِ الْمُلْکُ الْیَوْمَ" یعنی "آج کے دن بادشاہی کس کی ہے؟" اور پھر جواب میں فرمایا جائے گا : "لِلّٰہِ الْوَاحِدِ الْقَھَّارِ" (المؤمن : ۱۶) "آج تمام اختیار اور کل بادشاہی صرف اللہ کے لئے ہے جو الواحد ہے' تنہا ہے' یکتا ہے اور پوری طرح سے قابو یافتہ اور مسلّط ہے' مقتدرِ اعلیٰ ہے' جو چاہے کرے"۔

یہ ہے اس سورۂ مبارکہ کا پہلا حصہ جس کے بارے میں میں حدیث قدسی کے حوالے سے یہ بتایا جا چکا ہے کہ ان کلمات کی تاثیر کا یہ عالم ہے کہ اِدھر بندہ کہتا ہے "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ" اور اگر یہ دل سے نکلے ہوئے الفاظ ہوں تو فوراً اللہ تبارک و تعالیٰ جواب میں ارشاد فرماتا ہے : "میرے بندے نے میرا شکر ادا کیا" اور جب بندہ کہتا ہے "اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ" تو اللہ جواب میں فرماتا ہے : "میرے بندے نے میری ثناء کی"۔ جب بندہ کہتا ہے "مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ" تو اللہ فرماتا ہے : "میرے بندے نے میری بڑائی کا اعلان کیا اور میری عظمت بیان کی"۔

لفظ "اللہ" کی تحقیق

اس پوری بحث میں ایک دقیق لغوی و علمی مسئلے کو جان بوجھ کر نہیں چھیڑا گیا۔ اور وہ

ہے لفظ "اللہ" کی تحقیق۔ تاہم مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بارے میں چند بنیادی باتیں عام فہم انداز میں بیان کی دی جائیں۔

لغوی اعتبار سے لفظ "اللہ" کے بارے میں دو آراء ہیں۔ ایک یہ کہ یہ اسم جامد اور اسمِ عَلَم ہے' یعنی نہ اس کا کوئی مادہ ہے' نہ یہ کسی اور لفظ سے بنا ہے' بلکہ یہ اسم ذات ہے اس ہستی کا جس نے اس سلسلہ کون و مکان کو تخلیق فرمایا۔ لہٰذا اصل ضرورت اس اسم ہی کو حرزِ جاں بنانے اور دل پر کندہ کرنے کی ہے نہ کہ اس کے معنی کے کھوج کرید کی۔

دوسری رائے یہ ہے کہ یہ بھی باری تعالیٰ کے بقیہ تمام اسماء حسنیٰ کے مانند صفاتی نام ہے اور لفظ "الٰہ" پر لام تعریف داخل کر کے بنا ہے اور اس کے معنی ہیں الٰہ حقیقی اور معبودِ برحق!

پھر خود "الٰہ" کے مادے کی تحقیق بھی ایک دقیق اور طوالت طلب معاملہ ہے' لیکن تین مفہوموں پر تقریباً اجماع ہے۔ ایک وہ ہستی جس کی طرف حاجت روائی اور مشکل کشائی کے لئے رجوع کیا جائے' دوسرے وہ ہستی جس کے بارے میں عقل حیران اور سرگشتہ ہو کر رہ جائے اور تیسرے وہ ہستی جس سے والہانہ محبت ہو۔ اور اگر ذرا غور کیا جائے تو صاف نظر آ جائے گا کہ عوام الناس کی رسائی اکثر و بیشتر صرف پہلے مفہوم تک ہوتی ہے' جبکہ فلاسفہ کا تحیر و لاادریت دوسرے مفہوم کے مظہر ہیں اور صوفیاء تیسرے اور بلند ترین مفہوم سے سرشار ہوتے ہیں..... واللہ اعلم!!

جزوِ ثانی : عبادت اور استعانت

اس سورۂ مبارکہ کا جزو ثانی ایک آیت پر مشتمل ہے اور جیسا کہ اس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے یہ ہر اعتبار سے اس سورۃ کی مرکزی آیت ہے' یعنی

﴿اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ ۝﴾

یہاں پہلی بات یہ نوٹ فرمائیے کہ اس آیت میں دو فعل استعمال ہوئے ہیں' ایک

"نَعْبُدُ" اور دوسرا "نَسْتَعِیْنُ" یہ دونوں فعل مضارع ہیں۔ آپ کے علم میں ہو گا کہ اردو کی طرح عربی و فارسی میں فعل کی تین حالتیں ماضی' حال' اور مستقبل نہیں ہوتیں' بلکہ صرف دو حالتیں ہوتی ہیں' ایک ماضی اور دوسری مضارع' اور فعل مضارع میں حال اور مستقبل دونوں شامل ہوتے ہیں' لہٰذا "نَعْبُدُ" کا ترجمہ یہ بھی ہو گا کہ "ہم بندگی کرتے ہیں" اور یہ بھی ہو گا کہ "ہم بندگی کرتے رہیں گے"۔ اسی طرح "نَسْتَعِیْنُ" کا ترجمہ یہ بھی درست ہو گا کہ "ہم مدد مانگتے ہیں" اور یہ بھی صحیح ہو گا کہ "ہم مدد مانگیں گے"۔

دوسری بات یہ نوٹ کیجئے کہ اگر یہاں "نَعْبُدُکَ" کا لفظ ہوتا تو اس کے معنی ہوتے کہ "ہم تیری بندگی کرتے ہیں اور کریں گے" لیکن چونکہ ضمیر مفعولی "کَ" کو فعل سے پہلے لایا گیا اور اس کے لئے "اِیَّا" کا اضافہ کیا گیا' یعنی "اِیَّاکَ نَعْبُدُ" تو اس میں ایک مزید تاکیدی مفہوم پیدا ہو گیا اور وہ یہ کہ "ہم صرف تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور کریں گے"۔ اس کو قواعد کی رو سے حصر کا اسلوب کہا جاتا ہے۔ اس کو اس مثال سے سمجھا جا سکتا ہے کہ اگر یہ کہا جائے کہ "زید عالم ہے" تو اس سے ایک خاص مفہوم ذہن میں آئے گا' لیکن اگر یہ کہا جائے کہ "زید ہی عالم ہے" تو اس "ہی" کے اضافے سے مفہوم میں عظیم فرق واقع ہو جائے گا۔ اس لئے کہ جب یہ کہا گیا کہ زید عالم ہے تو دوسروں کے عالم ہونے کی نفی نہیں ہوئی۔ گویا دوسرے بھی عالم ہو سکتے ہیں۔ لیکن جب یہ کہا گیا کہ زید ہی عالم ہے' تو اس میں حصر پیدا ہو گیا اور اس کا مفہوم یہ ہو گیا کہ "علم" صرف زید ہی کے پاس ہے' دوسروں سے "علم" کی نفی ہو گئی۔ لہٰذا "اِیَّاکَ نَعْبُدُ" میں اسی حصر کا مفہوم پیدا ہے۔ اس کا ترجمہ اور حقیقی مفہوم ہو گا: "ہم صرف تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور کریں گے"۔ اسی طرح "اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ" کا مفہوم ہو گا: "ہم صرف تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں اور مانگیں گے"۔

تیسری بات یہ کہ اس آیت کا مرکزی لفظ "عبادت" ہے' جس کا ہم اقرار بھی کر رہے ہیں اور عہد بھی کر رہے ہیں۔ اس لئے کہ "ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں" یہ اقرار ہے یا اظہارِ واقعہ ہے۔ اور "ہم تیری ہی عبادت کرتے رہیں گے" یہ ایک وعدہ' قول و قرار اور

عہد و میثاق ہے۔

چوتھی اہم بات یہ ہے کہ عبادت کا حقیقی معنی و مفہوم کیا ہے؟ بدقسمتی سے اس لفظ عبادت کے بارے میں عوام الناس کے ذہنوں میں بڑا محدود تصور پایا جاتا ہے اور عام خیال یہ ہے کہ عبادت بس نماز' روزہ' حج اور زکوٰۃ کا نام ہے۔ چنانچہ جب بھی عبادت کا لفظ سامنے آتا ہے ذہن لامحالہ صرف ان عبادات ہی تک محدود ہو کر رہ جاتا ہے اور اس لفظ کی اصل عظمت اور وسعت سامنے نہیں آتی۔ اس لئے جان لیجئے کہ اس لفظ عبادت کا مادہ "ع ب د" ہے اور "عبد" غلام کو کہتے ہیں۔ غلامی کا وہ تصور جو کبھی دنیا میں رائج تھا وہ سامنے ہو تب اس لفظ کی اصل حقیقت سمجھ میں آتی ہے۔ جو شخص کسی کا عبد یعنی غلام ہوتا تھا' وہ اپنے آقا کی ملکیت ہوتا تھا۔ اس کا کام اپنے مالک کے احکام کو بجالانا ہوتا تھا۔ آقا جو حکم دیتا تھا غلام کا فرض تھا کہ وہ بسر و چشم اس کی تعمیل کرے۔ اس کی اپنی کوئی مرضی نہیں ہوتی تھی۔ اس لئے کہ غلام تو مملوک ہوتا تھا' اس کا کام تو اپنے آقا کی مرضی پر چلنا تھا۔ اس کی پسند اور ناپسند اول تو رہنی ہی نہیں چاہئے تھی اور اگر رہتی بھی تو اس کا فرض تھا کہ اسے پس پشت ڈال دے اور اپنے آقا کی پسند و ناپسند اور مرضی و ناراضی کو مقدم رکھے۔ پس معلوم ہوا کہ لفظ عبد میں جو تصور مضمر ہے وہ مکمل اور ہمہ تن' ہمہ وقت اور ہم جہت غلامی کا تصور ہے۔ فارسی میں اس کے لئے بہترین لفظ "بندگی" ہے' چنانچہ عبد کے مفہوم کے لئے بندہ کا لفظ عام طور پر مستعمل ہے۔ جیسے علامہ اقبال نے فرمایا۔

"تمیزِ بندہ و آقا فسادِ آدمیت ہے"

یعنی یہ کہ انسانوں ہی میں سے کوئی آقا بن جائے اور کوئی بندہ' تو اس سے زیادہ غلط اور خلافِ انسانیت بات اور کوئی نہیں! اس کے برعکس نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: "اے لوگو! تم سب اللہ کے بندے اور آپس میں بھائی بھائی بن جاؤ" تم سب اللہ کے بندے ہو' اس اعتبار سے برابر ہو' بھائی بھائی ہو' تم میں سے کوئی آقا اور غلام ہے ہی نہیں۔ حقیقی آقا اللہ ہے اور تم سب اس کے غلام ہو۔

بندگی کے اس ہمہ گیر تصور کو سامنے رکھ کر اس حقیقت کی جانب توجہ کی جائے تو پانچویں اہم بات یہ سامنے آئے گی کہ از روئے قرآن مجید غایتِ تخلیقِ جن و انس یہی

عبادتِ رب ہے۔ چنانچہ سورۂ ذاریات میں ارشاد ہوتا ہے : "وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ○" یعنی "میں نے جنوں اور انسانوں کو پیدا ہی اس لئے کیا ہے کہ وہ میری بندگی کریں"۔ یہ ہے ہماری غایت تخلیق۔ قرآن کریم کی اس آیت کی ترجمانی بڑی خوبصورتی سے شیخ سعدی رحمہ اللہ نے اس شعر میں کی ہے جو بہت سی مسجدوں میں لکھا ہوتا ہے کہ ؎

زندگی آمد برائے بندگی
زندگی بے بندگی شرمندگی

چھٹی قابل غور بات یہ ہے کہ کوئی شے جس مقصد کے لئے بنائی گئی ہو وہ اگر اس مقصد ہی کو پورا نہ کرے تو ظاہر بات ہے کہ وہ بے کار قرار پائے گی اور ہم اسے کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر پھینک دیں گے۔ لہٰذا جب انسان کی تخلیق ہوئی ہی بندگی کے لئے ہے تو اگر وہ بندگی کی روش کو اختیار نہ کرے یا اسے تج دے اور ترک کردے تو معلوم ہوا کہ اس کے وجود کا اب کم از کم انسانی سطح پر کوئی مقصد نہیں رہا۔ اور اس کی زندگی محض حیوانی سطح کی زندگی ہے یا شاید اس سے بھی کم تر!

اس ضمن میں ساتویں اہم بات یہ ہے کہ جب ہم اللہ سے عہد کرتے ہیں کہ "ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور کریں گے" تو یہ ایک بہت بڑا عہد ہے اور اس کے بہت سے تقاضے ہیں' جن کو سمجھے اور جانے بغیر عبادت کا حق ادا نہیں کیا جا سکتا۔ (یاد رہے کہ یہ باتیں ہمارے سامنے شرک فی العبادت کی بحث کے ضمن میں پہلے بھی آ چکی ہیں۔ یوں سمجھئے کہ اب ان کا ایک دوسرے سیاق و سباق میں اعادہ ہو رہا ہے۔)

عبادت کا سب سے پہلا تقاضا اطاعت ہے۔ اگر یہ نہیں ہے تو عبادت کی اساس ہی منہدم ہو جاتی ہے۔ پھر بندگی کہاں ہوئی؟ مزید برآں اطاعت اگر کُلی نہ ہو جزوی ہو تب بھی عبادت کی نفی ہو جاتی ہے۔ اس لئے کہ کسی غلام کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ اپنے آقا کے ایک حکم کو مانے اور ایک نہ مانے۔ غلام نے اگر آقا کے ایک حکم سے بھی سرتابی کی تو وہ مقامِ بندگی سے تجاوز کر گیا۔ لہٰذا اطاعت لازم ہے تمام احکام خداوندی کی' ہر آن اور ہر لحظہ! اور زندگی کا کوئی گوشہ بندگی سے خارج یا مستثنیٰ نہیں رہے گا۔ اسی لئے قرآن مجید میں فرمایا

گیا : "یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّۃً" (البقرہ : ۲۰۸) "اے اہل ایمان! (اطاعت اور) فرمانبرداری میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ" گویا جزوی اطاعت مطلوب نہیں ہے کہ اللہ کی کچھ باتوں پر تو سرِ تسلیم خم ہو اور کچھ باتوں سے انحراف کیا جائے۔ اس پر اللہ کا غضب بہت بھڑکتا ہے۔ چنانچہ سورۂ بقرہ کی آیت ۸۵ میں اس طرزِ عمل پر بڑی سخت وعید آئی ہے۔ فرمایا :

﴿اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْکِتٰبِ وَتَکْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنْ یَّفْعَلُ ذٰلِکَ مِنْکُمْ اِلَّا خِزْیٌ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا ۚ وَیَوْمَ الْقِیٰمَۃِ یُرَدُّوْنَ اِلٰٓی اَشَدِّ الْعَذَابِ ۭ وَمَا اللّٰہُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝﴾

"کیا تم ہماری کتاب (اور ہماری شریعت) کے بعض حصوں کو مانتے ہو اور کچھ حصوں کو نہیں مانتے؟ تو جو کوئی اس جرم کا ارتکاب کرے گا اس کی سزا اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ انہیں دنیا کی زندگی میں ذلیل و خوار کر دیا جائے اور قیامت کے دن شدید ترین عذاب میں جھونک دیا جائے اور اللہ اس سے بے خبر نہیں ہے جو تم کرتے ہو"۔

یہ ہے جزوی اطاعت پر اللہ تعالیٰ کے غیظ و غضب کا عالم! اس لئے کہ جزوی اطاعت حقیقت کے اعتبار سے استہزاء اور تمسخر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس آیت کے آخر میں فرمایا : "اور اللہ اس سے بے خبر نہیں ہے جو تم کر رہے ہو" اس گمان میں نہ رہنا کہ وہ تمہارے کرتوتوں سے واقف نہیں ہے بلکہ وہ تو العلیم' البصیر' اللطیف اور الخبیر ہے۔ اس سے تمہارا کوئی عمل پوشیدہ نہیں ہے۔

آٹھویں اور اہم ترین بات یہ ہے کہ ایک اطاعت ہوتی ہے زبردستی کی' جیسے ہم انگریز کے غلام تھے اور ہم اس کی اطاعت پر مجبور تھے۔ اس اطاعت پر بھی لغوی طور پر لفظ عبادت کا اطلاق ہو جائے گا اور قرآن مجید میں ہوا ہے۔ چنانچہ آل فرعون نے بنی اسرائیل کو جس طریقے سے اپنی غلامی کے شکنجے میں کسا ہوا تھا' اس کے لئے قرآن مجید میں یہی لفظ عبادت آیا ہے۔ فرعون نے بڑے طنطنے اور غرور کے ساتھ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون (علیہما السلام) کے بارے میں کہا تھا : "وَقَوْمُھُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ"

(المومنون : ۴۷) "ان دونوں کی قوم ہماری عابد ہے" یعنی ہماری غلام ہے۔ اسی طرح ایک موقع پر حضرت موسیٰؑ نے بھی فرعون سے فرمایا تھا : ".....اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ "یعنی "تو نے بنی اسرائیل کو اپنا غلام' اپنا محکوم اور مطیع بنالیا ہے"۔ لہٰذا اس نوع کی غلامی اور محکومی پر بھی لفظاً تو عبادت کا اطلاق ہو جائے گا لیکن اصطلاحاً اللہ کی جو عبادت مطلوب ہے وہ زبردستی اور مجبوری کی اطاعت نہیں بلکہ دلی آمادگی اور محبت کے ساتھ مطلوب ہے۔ اللہ کے احسانات و انعامات کا شعور و ادراک کرتے ہوئے کہ اس کے جذبۂ تشکر سے قلب و ذہن سرشار ہو جائیں' ان احساسات و جذبات کے ساتھ جب اللہ کی بندگی ہوگی' اس کی کامل اطاعت ہوگی تب عبادت کا اصل تقاضا پورا ہوگا' جس کو ہمارے ائمہ دین نے بڑی خوبصورتی سے یوں ادا فرمایا "اللہ کی جو عبادت مطلوب ہے' اس میں دو بنیادیں جمع ہونی چاہئیں "یعنی "ایک طرف اللہ کی انتہا درجہ کی محبت ہو اور دوسری طرف انتہا درجے میں اس کے سامنے تذلل اور عاجزی اختیار کی جائے' اس کے سامنے ہمہ تن جھک جایا جائے' بچھ جایا جائے"۔ جب یہ دونوں کیفیات ـــــ محبت اور تذلل ـــــ جمع ہو جائیں گی تو عبادتِ رب اور بندگیٔ رب کے تقاضے کی تکمیل ہوگی۔ محبتِ الٰہی عبادت کے لئے کس قدر لازمی ہے' مولانا رومؒ نے اسے اپنے زمانے میں بڑی خوبی سے ادا کیا تھا کہ ؎

شادباد اے عشقِ خوش سودائے ما
اے طبیبِ جملہ عِلّت ہائے ما

اور اس دور میں علامہ اقبال مرحوم نے اس کی اہمیت پر بڑی خوبصورتی سے روشنی ڈالی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ؎

عقل و دل و نگاہ کا مرشدِ اولیں ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دیں بتکدۂ تصورات

محبتِ الٰہی عبادت کی روح ہے' اگر یہ روح نہیں ہے اور صرف خالی خولی اطاعت ہے' دل کی محبت کی چاشنی اس میں شامل نہیں ہے تو علامہ اقبال کے بقول معاملہ یہ ہوگا کہ ؎

شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام!
میرا قیام بھی حجاب میرا سجود بھی حجاب

لہٰذا ہمیں اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ محبت درحقیقت عبادت کی روح ہے۔

نویں بات یہ ہے کہ عبادت میں اطاعتِ کلی و محبتِ حقیقی کے ساتھ جو تیسری چیز مطلوب ہے وہ اخلاص ہے۔ اس سے قبل سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع کے درس کے ضمن میں اقسامِ شرک کی بحث میں بھی یہ بات واضح ہو چکی ہے۔ آج پھر اس کا اعادہ کر لیجئے۔ عبادت کی قبولیت کی شرطِ لازم اخلاص ہے' یعنی اللہ کی بندگی پورے خلوص و اخلاص کے ساتھ ہونی چاہئے۔ اس میں کوئی ریاکاری نہ ہو اور اللہ کی رضا کے سوا کوئی اور چیز مطلوب و مقصود کے درجے میں نہ آجائے۔ مطلوب صرف اللہ کی رضا اور اخروی فلاح و نجات ہو۔ اگر یہ اخلاص و للّٰہیت موجود نہیں ہے بلکہ کوئی ریاکاری ہے' یعنی لوگوں پر اپنی عبادت گزاری اور اپنے زہد و تقویٰ کی دھونس جمانی ہے اور اپنی نیکی کا رعب قائم کرنا ہے' یا شہرت مطلوب ہے' یا دنیا کی کوئی منفعت پیش نظر ہے تو یہ خلوص سے خالی عبادت اللہ تعالیٰ کے یہاں قبول نہیں ہوگی۔ بلکہ' جیسا کہ اس سے قبل واضح ہو چکا ہے' شرکِ خفی شمار ہوگی۔ جیسے "اقسام شرک" کی بحث میں نبی اکرم ﷺ کی حدیث بیان ہو چکی ہے کہ "جس نے دکھاوے کے لئے نماز پڑھی وہ شرک کر چکا' جس نے دکھاوے کے لئے روزہ رکھا وہ شرک کر چکا' جس نے دکھاوے کے لئے صدقہ کیا وہ شرک کر چکا"۔ اس حدیث سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہمارے دین میں خلوص و اخلاص کی کس قدر اہمیت ہے اور ریا کی کتنی مذمت ہے کہ اس کے ڈانڈے شرک سے مل جاتے ہیں۔

اب آخری اور دسویں بات پر غور کیجئے کہ پوری زندگی میں پورے خلوص و اخلاص' شدید ترین قلبی محبت اور کامل اطاعت کے ساتھ عبادت کا حق ادا کرنا' واقعہ یہ ہے کہ یہ کوئی آسان کام نہیں ہے' بہت مشکل کام ہے۔ اس میں سب سے پہلے تو انسان کا اپنا نفس ہی آڑے آتا ہے۔ مولانا رومؒ نے کیا خوب کہا ہے کہ ؎

نفسِ ما ہم کمتر از فرعون نیست
لیکن او را عون ایں را عون نیست

فرعون کے پاس حکومت تھی' لاؤ لشکر تھا۔ اس لئے اس نے زبان سے بھی خدائی کا دعویٰ کر دیا تھا۔ میرا نفس بھی اگرچہ فرعون سے کمتر نہیں ہے البتہ اس کے پاس لاؤ لشکر نہیں ہے' اس

لئے وہ خدائی کا زبانی دعویٰ تو نہیں کرتا لیکن اندر سے وہ کہتا یہی ہے کہ میں نہیں جانتا کہ اللہ کا حکم کیا ہے! میری مرضی چلے گی ---- خود غور کیجئے کہ اذان کی آواز کان میں آگئی ہے گویا اللہ کا حکم ہے کہ نماز کے لئے آؤ۔ ادھر نفس کہہ رہا ہے کہ ابھی مزید سوتے رہو' مزید آرام کرو' یا جس دلچسپی میں مصروف ہو اسے جاری رکھو۔ اب فیصلہ کن بات یہ ہوگی کہ ہم نے کس کا حکم مانا! اگر نفس کی خواہش کو کچلتے ہوئے ہم نے اللہ کا حکم مانا اور نماز کے لئے نکل کھڑے ہوئے تو واقعی ہم بندۂ رب ہیں۔ اگر نفس کی خواہش پر عمل کیا اور اللہ کے حکم کو پسِ پشت ڈال دیا تو ہم بندۂ نفس ہو گئے ---- یہی بات سورۂ فرقان میں فرمائی گئی :

اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ ۭ اَفَاَنْتَ تَكُوْنُ عَلَيْهِ وَكِيْلًا ۝

(الفرقان : ۴۳)

"(اے نبی!) کیا آپ نے اس شخص کی حالت پر غور کیا جس نے اپنی خواہشِ نفس کو معبود بنالیا' تو کیا آپ ایسے شخص کا ذمہ لے سکتے ہیں!"

اسی حقیقت کو علامہ اقبال نے یوں ادا کیا۔

چو می گویم مسلمانم بلرزم
کہ دانم مشکلاتِ لا الٰہ را

یعنی "میں جب یہ کہتا ہوں کہ میں مسلمان ہوں تو مجھ پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے' اس لئے کہ مجھے معلوم ہے کہ لاالٰہ الااللہ پر پورا اترنا کتنا مشکل ہے!"

یہ ہے ربط و تعلق کہ جب بندہ کہے : "اِيَّاكَ نَعْبُدُ" تو اس پر ایک لرزہ طاری ہو جائے' اسے پورا احساس اور کامل شعور ہو کہ وہ کتنا بڑا قول و قرار کر رہا ہے۔ اس کیفیت میں اسے پناہ گاہ نظر آئے گی "وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ" کے الفاظ مبارکہ میں ---- کہ اے اللہ میں یہ وعدہ اور عہد تو کر رہا ہوں اور میں نے ارادہ اور عزم بھی کر لیا ہے کہ پوری زندگی تیری عبادت میں بسر کروں گا لیکن میں محض اپنی قوت اور طاقت کے بل پر اس ذمہ داری سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا اور اس عہد پر پورا نہیں اتر سکتا جب تک کہ تیری مدد شاملِ حال نہ ہو۔ میں اس عہد کے پورا کرنے میں تیری اعانت اور تائید و توفیق کا محتاج ہوں۔ تیری اعانت اور مدد شامل ہوئی تب ہی میں اس قول و قرار اور عہد و پیمان کو پورا کر

سکوں گا۔ یہ تو ہے اصل ربط و تعلق "اِیَّاکَ نَعْبُدُ" کے ساتھ "اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ" کا' اضافی طور پر اس میں اخلاص فی الدعاء کا مضمون بھی آگیا۔ اس لئے کہ یہاں بھی حصر کا اسلوب ہے۔ گویا ہر نوع کی حاجت روائی اور مشکل کشائی کے لئے اللہ ہی سے مدد کی درخواست کی جائے' اسی سے اعانت طلب کی جائے' اسی کے جناب میں استغاثہ پیش کیا جائے۔ یہ توحید فی الدعاء ہے' جس کا ذکر اس سے قبل اقسام شرک کی بحث کے ضمن میں ہو چکا ہے۔

اسی آخری بات کے ضمیمے کے طور پر یہ بھی نوٹ فرمالیجئے کہ ہر فرض نماز کے بعد جو اذکار نبی اکرم ﷺ کے معمول میں شامل تھے' ان میں یہ دعا بھی منقول ہے : "رَبِّ اَعِنِّی عَلٰی ذِکْرِکَ وشُکْرِکَ وَحُسْنِ عِبَادَتِکَ" یعنی "اے پروردگار میری مدد فرما تاکہ میں تجھے یاد رکھ سکوں' تیرا شکر ادا کر سکوں اور تیری عبادت کا باحسن وجوہ حق ادا کر سکوں"۔

جزوِ ثالث : درخواستِ ہدایت

سورۃ الفاتحہ کا تیسرا حصہ اگرچہ تین آیات پر مشتمل ہے تاہم ان سے جملہ ایک ہی بنتا ہے۔ آیئے کہ پہلے ان تین آیاتِ مبارکہ اور ان کے ترجمے پر ایک نظر ڈال لیں :

﴿ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۝ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝﴾ (آمین یاربّ العالمین!)

"(اے رب ہمارے!) ہمیں ہدایت بخش سیدھی راہ کی۔ راہ ان لوگوں کی جن پر تیرا انعام ہوا' جو نہ تو مغضوب ہوئے اور نہ گمراہ"۔

(اے تمام جہانوں کے مالک! ایسا ہی ہو)

پہلی تین آیات پر تدبر سے ہم پر یہ حقیقت واضح ہو چکی ہے کہ ایمان باللہ یا توحید اور ایمان بالآخرۃ یا معاد تک ایک سلیم الفطرت اور سلیم العقل انسان فطرت و عقل کی رہنمائی

میں از خود بھی رسائی حاصل کر سکتا ہے جس کے نتیجے میں اس کے باطن میں ایک بے پناہ جذبۂ تشکر پیدا ہو جاتا ہے۔ چوتھی آیت سے معلوم ہوا کہ اسی جذبۂ تشکر سے جذبۂ عبادت ابھرتا ہے۔ اس سے آگے واقعہ یہ ہے کہ عقل انسانی خود اپنی محدودیت اور نارسائی کا اعتراف کرتی ہے کہ جہاں تک صراطِ مستقیم یعنی زندگی بسر کرنے کے معتدل و متوازن طریقے کا تعلق ہے' وہاں انسانی عقل بے بس اور محتاج ہدایت ہے۔ چنانچہ یہ ہے وہ مقام جہاں بندہ سراپا احتیاج بن کر ایک استدعا اور ایک درخواست اپنے مالک کے حضور پیش کرتا ہے کہ اے رب ہماری رہنمائی فرما یعنی ہمیں دکھا اور چلا اس راستہ پر جس میں کوئی کجی نہ ہو' کوئی ٹیڑھ نہ ہو' افراط و تفریط کے دھکے نہ ہوں' جو ہمیں سیدھا تیری رضا تک پہنچانے والا' اور آخرت کی کامیابی و کامرانی اور فوز و فلاح سے ہمکنار کرنے والا ہو۔

"ہدایت" عربی زبان کا ایک نہایت وسیع المفہوم لفظ ہے۔ اس میں یہ مفہوم بھی شامل ہے کہ راستہ دکھایا جائے' بتا دیا جائے' سجھا دیا جائے' یہ مفہوم بھی شامل ہے کہ اس راستے پر ذہن اور قلب کو مطمئن کر دیا جائے اور یہ بھی شامل ہے کہ انگلی پکڑ کر اس راستے پر چلایا جائے اور بالآخر و بالفعل منزلِ مراد تک پہنچا دیا جائے۔ یہ ہدایت کے مختلف مراحل ہیں۔ سورۂ محمد (ﷺ) میں فرمایا: "وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى وَّاٰتٰىهُمْ تَقْوٰىهُمْ ○" (آیت ۱۷) "وہ لوگ جو ہدیت کے راستہ پر آئے اللہ نے ان کی ہدایت میں اضافہ کر دیا اور انہیں ان کے حصہ کا تقویٰ عطا فرما دیا"۔ اسی طرح سورۂ مریم میں فرمایا: "وَيَزِيْدُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اهْتَدَوْا هُدًى" (آیت ۷۶) "اور اللہ ان لوگوں کی ہدایت میں اضافہ فرماتا ہے جو ہدایت اور راست روی کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔" یہ ہدایت مسلسل بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اس میں ترقی ہوتی چلی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے تمام مدارج و مراحل مومنین صادقین کو طے کرا دیتا ہے یہاں تک کہ وہ اپنی منزل مراد تک جا پہنچتے ہیں اور جنت میں داخلے کے وقت ان کی زبانوں پر یہ ترانۂ حمد جاری ہو جاتا ہے: "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ هَدٰىنَا لِهٰذَا وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَآ اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ"۔ "سارا شکر و سپاس اور کل تعریف و ثناء اللہ ہی کے لئے ہے جس نے ہمیں راستہ دکھایا اور ہمیں یہاں تک پہنچا دیا اور ہم خود ہرگز راہ یاب نہ ہو سکتے اگر اللہ ہی

رہنمائی نہ فرماتا"۔ واضح رہے کہ یہی عقلی بنیاد ہے ایمان بالرسالت کی' کیونکہ ہدایتِ الٰہی رسولوں ہی کے واسطے سے بنی نوع انسان تک پہنچتی ہے۔ چنانچہ سورۂ اعراف کی اس آیت کے آخر میں کامیاب و بامراد مومنین کا یہ قول بھی نقل ہوا ہے : "لَقَدْ جَاءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ "یعنی "ہمارے رب کے رسول واقعی حق لیکر ہی تشریف لائے تھے"۔

یہاں یہ مغالطہ نہیں ہونا چاہئے کہ وہ شخص جو بنیادی حقائق تک خود پہنچ چکا ہے' جس نے اللہ کو پہچان لیا' اس کی توحید کو جان لیا' اس کی صفاتِ کمال کی معرفت حاصل کرلی' اس کی ربوبیت' رحمانیت و رحیمیت کا ادراک و شعور حاصل کرلیا' اس کے مالکِ یوم الدّین ہونے کا اقرار کرلیا' پھر اس کی بندگی اور پرستش کا عہد و پیمان کرلیا تو اسے تو گویا کل ہدایت حاصل ہوگئی۔ اب اسے کون سی مزید ہدایت مطلوب ہے جس کے لئے وہ دعا کر رہا ہے کہ "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ "۔ یہاں انسان کی احتیاج کی طرف اشارہ کیا جارہا ہے۔ وہ یہ ہے کہ انسان اس دنیوی زندگی کے مختلف معاملات میں جو نہایت پیچیدہ ہیں اور ان مسائل میں جو باہم گتھے ہوئے ہیں ایک اعتدال کی روش اور ایک متوازن طرزِ عمل کا محتاج ہے اور اس کی یہ احتیاج ہمیشہ باقی رہے گی' اس لئے کہ تمدن کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ ان مسائل و معاملات کی پیچیدگیاں بھی مسلسل بڑھتی چلی جاتی ہیں اور حیاتِ انسانی کی یہ پیچیدگیاں اور ان کے گوناگوں تقاضے اور مطالبے اور ان کا آپس میں ٹکراؤ اور تصادم' یہ عقدہ ہائے لاینحل ہیں اور کسی انسان کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ مجرد اپنی عقل اور تجربے کی بنیاد پر ان جملہ سماجی و معاشرتی اور سیاسی و معاشی مسائل کا متوازن و معتدل اور عادلانہ و منصفانہ حل تلاش کرسکے اور حیاتِ اخروی میں بھی نجات اور فوز و فلاح حاصل کرسکے' جس پر چل وہ حیاتِ دنیوی کی برکتوں اور سعادتوں سے بھی پر سکون طور پر ہمکنار ہوسکے۔ یہ ہے درحقیقت انسان کی اہم ضرورت جس کے لئے سلسلۂ نبوت و رسالت اور انزالِ وحی و کتب کی ضرورت پیش آئی۔ اور یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہئے کہ جہاں تک ایمان کے بنیادی تصورات کا تعلق ہے وہاں تک پہنچنے کے لئے انسان اپنی عقل اور فطرت سے بھی رہنمائی حاصل کرسکتا ہے' جیسا کہ سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع کے ذریعے یہ حقیقت ہمارے سامنے آچکی ہے کہ انسان اپنی فطرتِ صحیحہ اور عقل سلیم کی

رہنمائی میں توحید اور معاد تک رسائی حاصل کر سکتا ہے' لیکن زندگی کی پر پیچ وادیوں میں سیدھی راہ کی تلاش' یہ انسان کے بس میں نہیں ہے۔ اس کے لئے وہ مجبور ہے کہ گھٹنے ٹیک کر اپنے مالک سے ہدایت کی درخواست کرے' اس لئے کہ واقعہ یہ ہے کہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں اور یہی واحد ممکن راستہ ہے۔

اس بات کو انسانی تمدن کے چند پیچیدہ مسائل کی مثال سے اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے۔ اس ضمن میں اولین اور قدیم ترین مسئلہ یہ ہے کہ مرد اور عورت کے مابین حقوق اور فرائض کا صحیح توازن کیا ہے۔ ہر باشعور انسان جانتا ہے کہ اس معاملے میں تاریخ انسانی میں شدید افراط و تفریط نظر آتی ہے۔ کسی معاشرے میں عورت بالکل بھیڑ بکری کی طرح ایک مملوک کا مرتبہ رکھتی ہے۔ اس کے برعکس کہیں ہم دیکھتے ہیں کہ وہی عورت قلوپطرہ بن کر کسی ملک کی تقدیر کا فیصلہ کر رہی ہے اور اس کے لئے تباہی اور بربادی کا سامان فراہم کر رہی ہے۔ مرد و عورت کے درمیان توازن و اعتدال اور عدل و انصاف عقل انسانی کے بس میں نہیں ہے۔ اس لئے کہ انسان لازماً مرد ہو گا یا عورت' اور ان میں سے ہر ایک صرف اپنی ہی مصلحتوں اور مفادات کو مدنظر رکھنے پر مجبور ہے۔ گویا یہاں انسان اس فاطرِ فطرت کی رہنمائی کا محتاج ہے جس نے مرد کی تخلیق بھی کی ہے اور عورت کی بھی۔ جو دونوں کے عواطف اور میلانات کو بہ تمام و کمال جاننے والا ہے' جو تہذیب و تمدن میں دونوں کے حقوق و فرائض کا ایسا صحیح صحیح تعین کر سکتا ہے جس کی بدولت انسانی تمدن کی گاڑی دونوں پہیّوں پر ہمواری کے ساتھ سیدھی راہ پر آگے بڑھ سکے۔

دوسری مثال فرد اور اجتماعیت کے باہمی تعلق و توازن سے متعلق ہے۔ اگر افراد کی انفرادی آزادی پر حدِ اعتدال سے زیادہ زور ہوتا ہے اور ان کے حقوق کا ضرورت سے زیادہ لحاظ رکھا جاتا ہے تو پلڑا ایک جانب جھک جاتا ہے اور مادر پدر آزادی انتشار اور انارکی کا روپ دھار لیتی ہے۔ اس کے برعکس کہیں ایسا ہوتا ہے کہ اجتماعیت اس طور پر مسلط ہو جاتی ہے کہ اس کے نیچے فرد سسکنے لگتا ہے اور اس کے حقوق بالکل پامال ہو جاتے ہیں۔ اس کی آزادی اور حریت کو اجتماعیت کی بھینٹ چڑھا دیا جاتا ہے۔ ان دو انتہاؤں کے مابین توازن قائم رکھنا نہایت کٹھن ہے اور واقعہ یہ ہے کہ عقل انسانی اس کی صلاحیت نہیں

رکھتی کہ وہ ایسے صحیح نقطۂ عدل کا تعین کر سکے کہ فرد کے حقوق بھی برقرار رہیں' اس کی انفرادی شخصیت کے صحت مند ارتقاء کے امکانات بھی روشن رہیں' لیکن اس کے ساتھ ساتھ فرد معاشرے کے لئے ایک مضر اور نقصان دہ عنصر کی حیثیت اختیار نہ کر سکے' بلکہ ان دونوں کے مابین ایک مبنی برعدل اور کامل توازن والا نظام قائم ہو سکے۔ عمرانیات کی تاریخ سے ادنیٰ واقفیت رکھنے والے بھی اس سے واقف ہیں کہ انسانی عقل اور تجربات تاحال ایسا نظام قائم کرنے سے یکسر قاصر رہے ہیں اور ان کے تجویز کردہ نظام لازماً افراط و تفریط کا شکار رہے ہیں۔

یہی معاملہ معاشی مسائل کا بھی ہے جنہوں نے خاص طور پر صنعتی انقلاب کے بعد ایک نہایت گھمبیر اور لاینحل عقدے کی صورت اختیار کر لی ہے۔ یعنی یہ کہ سرمایہ اور محنت کے مابین صحیح توازن کیسے قائم کیا جائے اور اقتصادی معاملات میں عدل و اعتدال کے تقاضے کیسے پورے کئے جائیں۔ اس معاملے میں نقطۂ عدل و قسط کی تلاش میں نوع انسانی کتنی سرگرداں ہے اور کیسے کیسے تجربے کر رہی ہے' وہ روز روشن کی طرح ہمارے سامنے ہے۔ کہیں وہ انفرادی ملکیت کی نفی کلی کا تجربہ کرتی ہے جس سے انسان کی شخصی آزادی اور اس کی آزاد شخصیت کچل کر رہ جاتی ہے۔ کہیں ایسا ہوتا ہے کہ سرمایہ ایک بہت بڑے ڈکٹیٹر کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور ایک سرمایہ دارانہ آمریت معاشرے پر مسلط ہو جاتی ہے جس میں امیر' امیر تر اور غریب' غریب تر ہوتا چلا جاتا ہے اور کسانوں اور مزدوروں کے لئے ایک باعزت اور آسودہ زندگی بسر کرنا محال ہو جاتا ہے۔

یہ ہیں وہ تین پیچیدہ امہات المسائل جن کے گوناگوں شعبوں اور پیچ در پیچ شاخوں اور پھر ان کے متضاد تقاضوں کو ایک متوازن و معتدل نظام میں سمونے سے انسان قاصر ہے۔ اس لئے کہ ان کے حل کے لئے جب بھی انسان سوچے گا' اپنے قریبی ظروف و احوال میں رہ کر سوچے گا' اور ان کا حل تلاش کرنے میں وہ اپنی ذات' گروہ یا طبقے سے بلند تر ہو کر معتدل اور منصفانہ راہ تلاش نہ کر پائے گا اور اس کی سوچ میں کہیں نہ کہیں کجی رہ جائے گی۔ اس کا جھکاؤ کسی نہ کسی طرف ہو جائے گا۔ نتیجتاً وہ صراط مستقیم اور سَوَاءَ السَّبِیل سے بھٹک جائے گا۔ قرآن مجید اس معتدل اور متوازن راستے کو مختلف ناموں

سے تعبیر کرتا ہے۔ سورۂ فاتحہ میں اسے صراطِ مستقیم کہا گیا ہے یعنی سیدھا راستہ۔ کہیں اسے سَواء السَّبیل کہا گیا ہے' کہیں صِراط السَّوِیّ یعنی برابری کا راستہ' جیسے خط استوا ہے جو ہمارے کرۂ ارضی کو دو برابر حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ پس سَواء السَّبیل وہ راستہ ہو گا جس میں کامل توازن ہو' افراط و تفریط نہ ہو' کسی ایک جانب جھکاؤ نہ ہو جائے۔ کہیں اسے قَصدُ السَّبیل سے تعبیر کیا گیا ہے یعنی معتدل اور درمیانی راستہ جس میں نہ اینچ پینچ ہو نہ اونچ نیچ' کہیں اسے سبیل السَّلام کہا گیا ہے یعنی سلامتی کا راستہ جس میں امن و سکون ہو' ظلم و عدوان نہ ہو' تعدی و استحصال نہ ہو۔

یہ ہے درحقیقت انسان کی وہ احتیاج جس کے لئے وہ گھٹنے ٹیک کر اپنے پروردگار کے سامنے استدعا کرنے پر مجبور ہے کہ اے میرے رب! میں نے تجھے پہچان لیا' تیری توحید کو جان لیا' ادنیٰ درجہ ہی میں سہی لیکن مجھے تیری صفاتِ کمال کی معرفت بھی حاصل ہو گئی۔ میں نے یہ بھی جان لیا کہ مجھے مرنے کے بعد تیرے حضور میں حاضر ہونا ہے۔ میں یہ بھی جان چکا ہوں کہ اس دن کامل اختیار صرف تیرے ہاتھ میں ہو گا۔ میں نے یہ ارادہ اور عزم بھی کر لیا ہے کہ میں تیری ہی بندگی اور پرستش کروں گا اور اس کے لئے میں تیری ہی اعانت و امداد کا محتاج ہوں۔ لہٰذا اب میں تجھ سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ زندگی بسر کرنے کا صراطِ مستقیم' سواء السّبیل اور سبیل السلام مجھ پر واضح فرما دے۔ مجھے اس کی ہدایت عطا فرما' اس کے لئے میرے دل کو اطمینان و انشراح بخش۔ مجھے اس پر چلنے کی توفیق دے۔ اس پر چلاتے ہوئے مجھے میری کامیابی و کامرانی اور فوز و فلاح کی آخری منزل تک پہنچا دے۔ واضح رہے کہ یہی ایمان بالرسالت کی عقلی بنیاد ہے کیونکہ اس ہدایتِ ربانی کو انسانوں تک پہنچانے کے منصبِ جلیل پر رسولوں کی مقدس جماعت فائز ہوتی رہی ہے اور اس سلسلۃ الذّہب کی آخری کڑی ہیں' خاتم النبیّن' سید المرسلین' ہادیٔ آخر الزمان جناب محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

یہ ایک قاعدہ کلیہ ہے کہ جس چیز کی اہمیت و وقعت زیادہ ہوتی ہے اسے مزید واضح کیا جاتا ہے' چنانچہ انسان کے دل میں جس چیز کی محبت ہوتی ہے وہ اس کا ذکر کثرت سے کرتا ہے۔ لہٰذا اس صراط مستقیم کی اہمیت پر زور دینے کے لئے اس کی مزید وضاحت خود اس کی

زبان سے کرائی جارہی ہے کہ :

﴿ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ○ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ﴾

"(اے رب) ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت عطا فرما' ان لوگوں کے راستے کی جن پر تو نے انعام فرمایا"

یہ لوگ کون ہیں؟ اس سورۂ مبارکہ میں غایتِ اجمال و اختصار ہے۔ اس لئے یہاں ساری تفاصیل ممکن نہیں تھیں۔ لیکن قرآن مجید کی تفسیر کا یہ اصول پیش نظر رکھئے کہ "القرآنُ یفسّر بعضُہ بعضًا" یعنی "قرآن کا ایک حصہ دوسرے حصے کی تفسیر کرتا ہے"۔ اس کے مطابق اگر تلاش کیا جائے کہ "اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ" کی تفسیر قرآن مجید میں کہاں وارد ہوئی ہے تو سورۂ نساء کی یہ آیت سامنے آئے گی :

﴿ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ○ ﴾ (آیت : ۶۹)

"اور جو لوگ اللہ اور اس کے رسول اطاعت پر کاربند ہو جائیں گے ان کو معیت اور رفاقت نصیب ہوگی ان کی جن پر اللہ کا انعام ہوا یعنی انبیائے کرام' صدیقین' شہداء اور صالحین۔ اور بہت ہی اچھے ہیں یہ رفیق (جو کسی کو میسر آجائیں)"۔

یہ چار گروہ ہیں مُنعَم علیہم کے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ کا انعام و فضل ہوا' یہ ہیں وہ لوگ جن کو اللہ نے اپنی نعمتوں سے نوازا۔ ان میں انبیائے علیہم السلام سب سے بلند اور سب سے اونچے مرتبے پر فائز ہیں۔ ان کے بعد درجہ ہے حضراتِ صدّیقین کا۔ ان کے بعد تیسرے نمبر پر آتے ہیں شہدائے کرام' پھر چوتھے نمبر پر عام مومنین صالحین ہیں۔ اس موقع پر نوکِ قلم پر دعا آرہی ہے کہ اے رب ہمارے! ہمیں ان مُنعَم علیہم کے راستے کی ہدایت بخش' ہمیں ان کے راستے پر چلنے کی توفیق عطا فرمادے اور ہمیں ان کی رفاقت نصیب فرما!

صراطِ مستقیم کی اس مثبت انداز میں وضاحت کے بعد ایک سلبی اور منفی انداز میں بھی وضاحت کی گئی :

﴿ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ○ ﴾

"جو نہ مغضوب علیہم میں شامل ہیں اور نہ ہی گم کردہ راہ ہیں"۔

درحقیقت یہ دو کیفیات یا دو درجات ہیں جنہیں ان الفاظ میں بیان کیا گیا۔ ایک درجہ مغضوب علیہم کا ہے جو بہت ہی ناپسندیدہ ہے اور گویا ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِیْدًا کا مصداق ہے۔ جب کوئی فرد یا قوم یا امت ہدایت کی راہ کو اپنے نفس کی شرارتوں کے باعث اور اپنی خواہشات و شہوات کا اتباع کرتے ہوئے جان بوجھ کر چھوڑ دے' صداقت و ہدایت کی راہ سے جان بوجھ کر اعراض کرے' اس سے منہ موڑے تو ان کو قرآن "مغضوب علیہم" قرار دیتا ہے۔ یعنی جن پر اللہ کا غضب نازل ہوا۔ گویا جو لوگ حق کو حق اور باطل کو باطل جان کر بھی اپنے تعصبات کی وجہ سے یا اپنی خواہشات کی وجہ سے یا اپنے تکبر اور حسد کی بنیاد پر حق کو چھوڑ کر باطل کو اختیار کرتے ہیں تو وہ مغضوب علیہم ہیں۔

ایک دوسرا گروہ ان کا ہے جو مغالطوں میں مبتلا ہو کر گمراہ ہو جاتے ہیں۔ اس معاملے میں کبھی ایسا بھی ہوتا ہے' جیسے ہم "نیکی کی حقیقت" کی بحث میں دیکھ چکے ہیں کہ انسان غلط راستہ پر چل پڑتا ہے۔ اس کا کوئی اچھا جذبہ غیر معتدل ہو کر کسی غلط صورت میں ڈھل جاتا ہے۔ اس گروہ کے متعلق قرآن کہتا ہے : ضَآلِّیْنَ وہ لوگ جو بھٹک گئے' گم کردہ راہ ہیں' وہ قافلہ جو اپنا صحیح راستہ بھول کر کسی دوسری جانب نکل گیا ..... لفظ "ضال" کا ایک دوسری صورت پر بھی اطلاق ہوتا ہے کہ جو شخص ابھی تلاشِ حقیقت میں سرگرداں ہو' اس کے اندر طلبِ ہدایت موجود ہو' لیکن ابھی وہ غور و فکر کے مراحل طے کر رہا ہو۔ ایسے شخص کے لئے بھی یہ لفظ استعمال ہو جاتا ہے۔ چنانچہ نبی اکرم ﷺ کے بارے میں بھی سورۃ الضحیٰ میں یہی لفظ استعمال کیا گیا : "وَوَجَدَکَ ضَآلًّا فَھَدٰی ○" یعنی "(اے نبیؐ!) آپؐ کو پایا آپ کے رب نے تلاش حقیقت میں سرگرداں تو آپ پر ہدایت کا راستہ کھول دیا۔" آپؐ میں تلاش حقیقت کا جذبہ اس شدت کے ساتھ ابھرا کہ آپؐ نے غار حرا کی خلوت گزینی غور و فکر اور سوچ بچار میں کلی انہماک کے لئے اختیار فرمائی' لہٰذا پروردگار کی جانب سے پردے اٹھا دیئے گئے اور وحی کا آغاز ہو گیا۔

الغرض ضالین کا لفظ مغضوب علیہم کی بہ نسبت بہت ہلکا ہے۔ مغضوب علیہم وہ لوگ ہیں جنہوں نے شرارت نفس کے طفیل محض اپنی خواہشات و شہوات کے اتباع میں حق کو

جان بوجھ کر ترک کر دیا اور ضالین وہ ہیں جو یا تو کسی مغالطے کے باعث راہ حق سے بھٹک گئے یا ابھی تلاش حق میں سرگرداں ہیں۔ مفسرین کے نزدیک مغضوب علیہم کی سب سے بڑی مثال یہود ہیں' جنہوں نے جو ٹھوکریں کھائیں وہ کسی اندھیرے کے باعث نہیں کھائیں بلکہ اس وقت کھائیں جب سورج نصف النہار پر چمک رہا تھا۔ ان کے پاس اللہ کا کلام موجود تھا' اللہ کی ہدایت موجود تھی' اللہ کی شریعت موجود تھی' لیکن اپنی شرارتِ نفس کے باعث انہوں نے اس میں تحریفات کیں۔ اس کے بجائے کہ اپنے آپ کو اللہ کی منشاء کے مطابق ڈھال لیتے انہوں نے اللہ کے کلام اور اس کے قانون کو اپنی خواہشات کے رخ پر ڈھال لیا۔ یعنی وہی رویّہ ہے جو علامہ اقبال کے بقول ہمارے علمائے سُوء نے اختیار کیا کہ ۔

خود بدلتے نہیں' قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق

اگرچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم النبیّین 'امتِ مسلمہ کے آخرالامم اور قرآن کے ع "نوعِ انساں راپیامِ آخریں!" کے مصداق آخری کتاب ہونے کی برکت سے قرآن کا متن محفوظ و مصؤن رہا اور تحریف جو بھی ہوئی صرف ترجمہ اور تفسیر میں ہوئی جبکہ سابقہ امتیں' بالخصوص یہود اس معاملے میں بہت دور نکل گئے تھے اور ان کے علماء نے تو اللہ کی کتاب میں لفظی تحریف تک کر دی تھی۔ لہٰذا یہ "مغضوب علیھم" کے زمرے میں شامل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے متعلق قرآن کہتا ہے۔ : "ضُرِبَتۡ عَلَيۡهِمُ الذِّلَّةُ وَالۡمَسۡكَنَةُ وَبَاءُوۡ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ" یعنی "ان پر ذلت اور مسکنت تھوپ دی گئی اور وہ اللہ کا غضب لے کر لوٹے۔" اس لئے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے حامل ہونے کے باوجود اپنی شراتِ نفس کے باعث اس ہدایت سے روگردانی کی اور اپنی خواہشاتِ نفس کا اتباع کیا اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کی مخالفت میں پیش پیش رہے۔

سابقہ امم میں سے "ضالین" کی نمایاں مثال نصاریٰ یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متبعین ہیں۔ اس لئے کہ محبت اور عقیدت کے غلو میں انہوں نے حضرت مسیحؑ کا مقام اتنا بڑھایا کہ معاذاللہ انہیں اللہ کا بیٹا قرار دیا۔ ساتھ ہی عملی طور پر انہوں نے رہبانیت کی

بدعت اختیار کی جس کے متعلق سورۂ حدید میں ارشاد ہوا : "وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ" یعنی "رہبانیت کی بدعت خود انہوں نے اختیار کی' ہم نے اسے ان پر لازم نہیں کیا تھا"۔ یہ درحقیقت ایک خلافِ فطرت نظام تھا جو انہوں نے خود اپنی مرضی سے اپنی نیکی کے جذبے میں حد اعتدال سے تجاوز کرتے ہوئے اپنے اوپر غیر فطری پابندیاں عائد کرتے ہوئے اختیار کر لیا تھا۔ ان میں کچھ لوگ تو ضرور ایسے باہمت نکلے جو ان پابندیوں کو نباہ گئے لیکن ان کی اکثریت ان پابندیوں کو نباہ نہ سکی۔ نتیجتاً جو کچھ ہونا چاہئے تھا وہ ہوا اور راہب خانوں کے تہہ خانوں میں ناجائز اولاد کے قبرستان آباد ہو گئے۔ یہ سارا معاملہ اس لئے ہوا کہ انہوں نے فطرت کے خلاف کام کیا۔ چنانچہ مفسرین کی اکثریت کے نزدیک سورۂ فاتحہ میں "مغضوب علیہم" سے مراد یہود اور "ضالین" سے مراد نصاریٰ ہیں۔ ویسے اس مفہوم کو عام رکھا جائے تب بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ اگرچہ ان کی دو نمایاں مثالوں سے یہ بات صد فیصد درست ہے۔

بہرحال یہ ہے سورۂ فاتحہ کا وہ تیسرا حصہ جس کے بارے میں اس حدیثِ قدسی میں جس کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں : "هٰذَا لِعَبْدِي وَلِعَبْدِي مَا سَأَلَ" یعنی "یہ میرے بندے کے لئے ہے اور میں نے دیا اپنے بندے کو جو اس نے طلب کیا"۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ حدیث قدسی اس سورۂ مبارکہ کے تجزیہ میں بھی بہت مفید ہے اور اس کی عظمت کو بھی بتمام و کمال اور بحسن و خوبی ظاہر کر رہی ہے۔ یہ فطرتِ انسانی کی وہ ترجمانی ہے کہ اگر واقعتاً یہ الفاظ کسی شخص کی زبان سے گہرے شعور و احساس اور قلب و ذہن کی گہرائیوں سے نکل رہے ہوں تو ان کی تاثیر وہی ہے جو اس حدیث قدسی میں وارد ہوئی کہ اِدھر بندہ ایک ایک جملہ کہتا ہے اُدھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا جواب ملتا چلا جاتا ہے۔ بقول علامہ اقبال۔

افلاک سے آتا ہے نالوں کا جواب آخر
کرتے ہیں خطاب آخر' اٹھتے ہیں حجاب آخر

سورۂ فاتحہ کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ سورۂ مبارکہ قرآن حکیم کا ایک نہایت خوبصورت اور انتہائی موزوں مقدمہ اور دیباچہ ہے۔ فطرت انسانی کی وہ پیاس

اور صراطِ مستقیم کی وہ احتیاج جس کی ترجمانی سورۂ فاتحہ میں کی گئی ہے اسی کی جانب رہنمائی کے لئے قرآن مجید نازل ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس سورۂ مبارکہ کے فوراً بعد وارد ہوتے ہیں یہ الفاظِ مبارکہ "الٓمّٓ ۝ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝" یعنی یہ ہے وہ کتاب جو ہر شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ یہ کسی فلسفی کے من گھڑت خیالات و نظریات اور ذہن انسانی کی تگ و تاز پر مبنی نہیں ہے۔ یہ "الحق" یعنی سراسر حق پر مبنی ہے۔ یہ کتاب ان لوگوں کی ہدایت و رہنمائی کے لئے نازل ہوئی ہے جن میں سیدھے راستے کی طلب اور پیاس موجود ہے۔ گویا یہ ہے اس سورۂ مبارکہ کا پورے قرآن مجید کے ساتھ تعلق۔ مزید برآں مباحثِ ایمان کے ذیل میں اس سورۂ مبارکہ کے مطالعہ سے یہ بات متعین ہو جاتی ہے کہ انسان اپنی عقل اور فطرت کی رہنمائی میں کہاں تک رسائی حاصل کر سکتا ہے۔ یہی ہے وہ بات جسے علامہ اقبال نے یوں بیان فرمایا۔

عقل گو آستاں سے دُور نہیں
اس کی قسمت میں پر حضور نہیں

عقل یقیناً آستان سے دور نہیں ہے' اس کی رہنمائی میں انسان بہت کچھ حاصل کر سکتا ہے۔ لیکن جہاں وہ محتاج ہے وہ درحقیقت وہ ہدایت و رہنمائی ہے جو اسے اپنی زندگی کے گوناگوں اور مختلف پہلوؤں میں ہر ہر لحظہ اور ہر ہر قدم پر عمل کے لئے درکار ہے۔ اس کے لئے وہ ہدایتِ آسمانی کا بالکلیہ محتاج ہے۔ اسی لئے اس کی فطرت پکارتی ہے اور استدعا کرتی ہے: اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ۔ اس فطرت کی پکار کا جواب ہے پورا قرآن مجید۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی صراطِ مستقیم کی ہدایت بخشے اور اس پر استقامت کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ۝

''ایک اہم اقتصادی مسئلہ اور اس کا حل''

مولانا محمد طاسین، صدر مجلس علمی کراچی

زیر نظر مضمون اس سلسلۂ مضامین کی ایک کڑی ہے جو پچھلے کئی ماہ سے ''ایک اہم اقتصادی مسئلہ اور اس کا حل'' کے عنوان کے تحت قارئین حکمت قرآن کے لئے دلچسپی کا موضوع بنا ہوا ہے۔

مسئلہ زیر بحث یہ ہے کہ روپے پیسے کے قرض میں رقم کی واپسی اصل زر کی مقدار کے مطابق ہونی چاہئے یا اصل زر کی قدر کے مطابق؟ مولانا محمد طاسین مدظلہ، کی تحقیق دو مراسلات کی صورت میں ''حکمت قرآن'' کی زینت بن چکی ہے جس میں انہوں نے یہ رائے دی ہے کہ قرض خواہ کو رقم کی واپسی اصل زر کی قدر کے مطابق ہونی چاہئے۔ اس کے برخلاف برادرم حافظ عاطف وحید نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ قرض خواہ کو رقم کی واپسی اصل زر کی مقدار کے مطابق ہی کی جا سکتی ہے۔

زیر نظر مضمون میں مولانا محترم نے اپنے موقف کو مزید شرح و بسط کے ساتھ پیش کیا ہے۔ مزید برآں اپنے مراسلے میں مولانا نے قارئین کی توجہ اس امر کی جانب مبذول کروائی ہے کہ اسلام آباد سے شائع ہونے والے ایک موقر ماہنامے ''فکر و نظر'' میں ''انڈکسیشن'' کے عنوان کے تحت سال ۹۵ء کے بعض شماروں میں دو محققین، جناب محی الدین شاہ اور جناب محمد طاہر منصوری کے مابین علمی مناقشے میں اس سے ملتا جلتا موضوع زیر بحث رہا ہے جس میں کرنسی کی شرعی حیثیت کے بارے میں جناب محی الدین شاہ کا موقف تقریباً وہی ہے جو کہ مولانا کا ہے، جبکہ جناب محمد طاہر منصوری کی رائے حافظ عاطف وحید کی رائے سے ہم آہنگ ہے۔ لہٰذا اس مسئلے سے دلچسپی رکھنے والے حضرات اس بحث کو بھی ضرور پڑھیں تاکہ دونوں موقف مزید نکھر کر سامنے آجائیں۔ اس مضمون میں مولانا کا روئے سخن زیادہ تر جناب طاہر منصوری کی جانب ہے۔ مولانا کے مراسلے کا متعلقہ حصہ درج ذیل ہے۔ (ادارہ)

اوپر محترم جناب طاہر منصوری صاحب کے جس مضمون کا ذکر کیا گیا ہے اس کی بعض عبارات سے ایسا لگتا ہے کہ موصوف دو الگ الگ مسئلوں کو ایک سمجھنے کی غلطی میں مبتلا

ہیں جس کا سبب عجلت میں غور و فکر کی کمی ہی ہو سکتا ہے۔ اس کی کچھ توضیح و تفصیل یہ ہے کہ کرنسی نوٹوں کی شرعی حیثیت کی بحث میں دو الگ الگ مسئلے ہیں جن کو آپس میں خلط ملط نہیں کرنا چاہئے۔ ایک مسئلہ یہ ہے کہ آج کی دنیا میں کرنسی نوٹوں کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ اور دوسرا مسئلہ ہے کہ کرنسی نوٹوں کے طویل المیعاد قرض کی ادائیگی کا' جبکہ افراط زر کی وجہ سے ان کی قوت خرید میں نمایاں کمی واقع ہو گئی ہو' پہلے مسئلہ سے متعلق بعض علماء اسلام کی رائے یہ ہے کہ چونکہ ابتداء میں کرنسی نوٹ سونے اور چاندی کے سکوں کے حوالے سے وجود میں آئے اور ان کو سونے چاندی کے سکوں کے حصول کے لئے سند اور وثیقہ قرار دیا گیا لہٰذا آج بھی ان کی وہی حیثیت ہے جو شروع میں تھی۔ ان علماء کرام کے نزدیک سونے چاندی کے سکوں کے متعلق جو شرعی احکام ہیں وہ ان کرنسی نوٹوں پر چسپاں اور لاگو نہیں ہوتے مثلاً زکوٰۃ نہ ان نوٹوں پر واجب ہوتی اور نہ ان کے ذریعے ادا ہوتی ہے تاوقتیکہ یہ نوٹ سونے چاندی کے سکوں میں تبدیل نہ ہو جائیں یا ان سے سونا چاندی وغیرہ نہ حاصل ہو جائے۔ جبکہ عہد حاضر کے علماء کی عظیم اکثریت کی رائے اس مسئلہ کے متعلق یہ ہے کہ چونکہ آج سونے چاندی کے سکے باقی نہیں رہے اور نوٹوں پر لکھی ہوئی عبارت عملاً کالعدم ہو گئی ہے لہٰذا آج کرنسی نوٹوں کی حیثیت وہ بن گئی ہے جو پہلے سونے چاندی کے سکوں کی تھی۔ مثلاً ان پر زکوٰۃ واجب بھی ہے اور ان سے زکوٰۃ ادا بھی ہوتی ہے' نیز ان کے ذریعے خرید و فروخت' مہر' دیت اور شرکت و مضاربت کے معاملات درست قرار پاتے ہیں ٹھیک اس طرح جس طرح سونے چاندی کے سکوں کے ذریعہ سے درست قرار پاتے ہیں۔ گویا بہت سے معاملات میں کرنسی نوٹوں کی حیثیت' سونے چاندی کے سکوں کی طرح تسلیم کر لی گئی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ آج برصغیر پاک و ہند اور عرب ممالک کے کثیر التعداد علماء کرام کا اس دوسری رائے پر اتفاق ہے لیکن اس اتفاق کو اجماع سمجھنا اور کہنا لکھنا کسی طرح صحیح نہیں۔ کیونکہ اصول الفقہ کی اصطلاح میں اجماع کسی مسئلہ پر علماء کی اکثریت کے متفق ہونے کا نام نہیں بلکہ ایک زمانے کے تمام علماء کے اتفاق کا نام ہے۔ چنانچہ ہم عصر علماء میں سے ایک کی طرف سے بھی اختلاف سامنے آئے تو وہ اجماع منعقد نہیں ہوتا۔ اور چونکہ مسئلہ مذکور کے متعلق علماء کے درمیان

اختلاف رائے موجود ہے لہٰذا بڑی اکثریت کے اتفاق رائے کو اجماع سے تعبیر کرنا غلط ہے' جو جناب طاہر منصوری صاحب نے بار بار اپنے مضمون میں استعمال کیا ہے۔ بہرحال میں بھی اس دوسری رائے کا حامی اور موید ہوں۔ لیکن اول الذکر رائے کو بھی بالکل غلط اور باطل نہیں سمجھتا کیونکہ اصولی طور پر وہ بھی درست ہے۔ گو عملی طور پر مشکل ہے جبکہ اس کے مقابلہ میں دوسری رائے پر عمل کرنا آسان ہے۔

قارئین حکمت قرآن کو یہ اچھی طرح معلوم ہونا چاہئے کہ اوپر اکثر علماء کرام کے حوالے سے جو رائے بیان کی گئی ہے اس کا تعلق پہلے مسئلہ سے ہے دوسرے مسئلہ سے نہیں۔ اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ جناب طاہر منصوری صاحب نے اپنے مضمون میں ص ۵۴' ۵۵ پر جن کتابوں کے حوالے دیئے ہیں جیسے فقہ الزکوٰۃ اور فوائد البنوک' جن کے مصنف شیخ یوسف القرضاوی ہیں نیز علامہ رشید رضا کی کتاب "یسر الاسلام واصول التشریع" اور دکتور وہبہ الزحیلی کی کتاب "فقہ الاسلامی و ادلتہ" ان سب کتابوں کی متعلقہ عبارتوں کا تعلق پہلے مسئلہ سے ہے۔ اسی طرح اسلامی فقہ اکیڈمی جدہ کی جو قرارداد نیز اسلامی ترقیاتی بینک جدہ کے سیمینار کی جو قرارداد نقل کی گئی ہے ان کا تعلق بھی پہلے مسئلہ سے ہے۔ یعنی یہ کہ آج کی دنیا میں کرنسی نوٹوں کی حیثیت تقریباً وہی ہو کر رہ گئی ہے جو پہلے سونے اور چاندی کے سکوں کی تھی۔ لہٰذا جو شرعی احکام دراہم و دنانیز سے متعلق تھے وہ آج ان کرنسی نوٹوں سے متعلق ہیں۔ پھر جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا میں بھی اسی کا قائل ہوں لیکن میں کبھی بھول کر بھی یہ بات نہیں کہہ سکتا کہ اس پر امت کا اجماع ہو گیا ہے۔

اب دوسرے مسئلہ کی طرف آیئے جو اوپر عرض کیا گیا ہے یعنی یہ کہ کرنسی نوٹوں کے طویل المیعاد قرض کی ادائیگی جبکہ ان کی قوت خرید میں نمایاں طور پر کمی واقع ہو گئی ہو' کس طرح اور کس صورت سے کی جائے؟ اس مسئلہ کے متعلق بھی دو مختلف رائیں ہیں۔ بعض کی رائے ہے کہ تعداد میں جتنے نوٹ قرض لئے دیئے گئے ہوں ادائیگی کے وقت اتنے ہی لئے دیئے جائیں خواہ ان کی قوت خرید کتنی ہی کم کیوں نہ ہو گئی ہو۔ جبکہ دوسرے بعض علماء کی رائے ہے کہ ادائیگی کے وقت ان کی قوت خرید کا ضرور لحاظ رکھا

جائے اور اس کے مطابق ادائیگی کی جائے۔ خواہ اس میں نوٹوں کی تعداد زیادہ ہی کیوں نہ ہو جائے۔ بلکہ اس میں نوٹوں کی ابتدائی حالت کا لحاظ رکھتے ہوئے سونے چاندی کو معیار بنایا جائے۔ مطلب یہ کہ یہ دیکھا جائے کہ جب کرنسی نوٹ قرض لئے دیئے گئے تھے اس وقت بازار میں ان کے عوض کتنا سونا مل سکتا تھا۔ اب ادائیگی کے وقت اتنا سونا جتنے نوٹوں سے مل سکتا ہو اتنے نوٹ ادا کئے جائیں۔ کیونکہ قرض حسن کے متعلق اسلامی عدل کا تقاضا یہ ہے کہ اس کی واپسی میں حقیقی طور پر مماثلت ہو۔ اور نوٹوں کی واپسی میں حقیقی طور پر مماثلت کا مطلب ہے قوت خرید کے لحاظ سے مماثلت' بالفاظ دیگر مالیت کے لحاظ سے برابری و مساوات۔ اور یہ اس لئے بھی کہ اگرچہ کرنسی نوٹوں کو آج دنیا میں عملاً وہ حیثیت حاصل ہو گئی ہے جو سونے چاندی کے سکوں کو پہلے حاصل تھی لیکن یہ حیثیت حقیقی نہیں اعتباری ہے۔ سونے چاندی کے سکوں اور کرنسی نوٹوں کے مابین ثمنی مشابہت و مماثلت موجود ہونے کے باوجود بعض پہلوؤں سے جوہری فرق موجود ہے اور وہ یہ کہ اگر حکومت ان کی ثمنی حیثیت کو ختم کر دے تو کرنسی نوٹ کاغذ کے بے قیمت پرزے بن کر رہ جاتے ہیں جن کے عوض کوئی قیمتی چیز نہیں مل سکتی' بخلاف سونے چاندی کے سکوں یا دوسری دھات کے سکوں کے ان کی ثمن ہونے کی حیثیت ختم ہونے کے بعد بھی ان کی قدر و قیمت باقی رہتی ہے۔ اور ان کے عوض ضرورت کی قیمتی اشیاء حاصل کی جا سکتی ہیں۔ اور یہ وہ فرق ہے جس کا کوئی ہوش مند انسان انکار نہیں کر سکتا۔ دوسرا فرق یہ کہ افراط زر کی وجہ سے کرنسی نوٹوں کی قوت خرید میں ضرور کمی واقع ہوتی ہے۔ جبکہ سونے چاندی کے سکوں کی قوت خرید عام طور پر ثابت و برقرار رہتی ہے۔ چنانچہ اس فرق کی وجہ سے سونے چاندی کے سکوں کے قرض اور کرنسی نوٹوں کے قرض کے معاملہ میں بعض پہلوؤں سے فرق ہو جانا عقل و قیاس کے عین مطابق ہے جس کا کوئی صاحب تفقہ انکار نہیں کر سکتا۔

پہلی رائے رکھنے والے حضرات اپنے رائے کی حمایت میں یہ فرماتے ہیں کہ چونکہ ایک حدیث نبوی میں ہم جنس اشیاء کے تبادلے میں ضروری ٹھہرایا گیا ہے کہ وہ برابری کے ساتھ ہو اور اضافے کو ربا قرار دے کر اس سے منع فرمایا گیا ہے' اور چونکہ قرض میں

لئے اور دیئے جانے والے کرنسی نوٹ ہم جنس نہیں لہٰذا ان کے تبادلے میں زیادتی ربا کے حکم میں آتی اور حرام ہے۔ لیکن تعجب ہے کہ یہ حضرات یہ تک نہیں سوچتے کہ زیر بحث مسئلہ کا تعلق قرض کے معاملہ سے ہے جس میں وہ زیادتی ربا کا مصداق ہوتی ہے جو مشروط اور مدت قرض کے مقابلہ میں مقرر کی جاتی ہے جبکہ مسئلہ زیر بحث میں پہلے تو کوئی حقیقی زیادتی ہوتی ہی نہیں۔ نوٹوں کی تعداد کا بڑھ جانا دراصل اس کمی کی تلافی ہوتا ہے جو افراط زر سے ان کی قوت خرید میں واقع ہوتی ہے اور اگر بالفرض محال اس کو قرض کے اصل مال پر زیادتی مان بھی لیا جائے تو وہ چونکہ اجل کے مقابل میں مشروط نہیں ہوتی لہٰذا اس کو ربا نہیں کہا جاسکتا۔ اور پھر اس استدلال میں جس حدیث نبوی کو پیش کیا جاتا ہے اس کا تعلق قطعی طور پر بیع کے معاملہ سے ہے۔ اسی طرح حدیث نبوی میں جن چھ چیزوں کا ذکر ہے یعنی سونا' چاندی' گیہوں' جو' تحر اور نمک' یہ حقیقی اموال ہیں جبکہ کرنسی نوٹ حقیقی مال نہیں اعتبار اور مجازی مال ہیں' جو ہمیشہ ثمن رہتے ہیں اور کبھی مبیع نہیں بن سکتے۔ غرضیکہ دلائل کے لحاظ سے پہلی رائے نہایت کمزور اور ناقابل اعتماد ہے جبکہ اس کے مقابلہ میں دوسری رائے قوی اور قابل اعتماد و اعتبار ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ پاک و ہند کے اکثر علماء اس کو صحیح سمجھتے اور مفتیان کرام اس کے مطابق فتویٰ دیتے ہیں۔

قارئین حکمت قرآن کی آگاہی کے لئے ایک ضروری بات یہ عرض کرنی ہے کہ ہندوستان میں اسلامک فقہ اکیڈمی کے نام سے ایک موقر علمی ادارہ قائم ہے جس کے قیام کا اصل مقصد ایسے جدید مسائل پر بحث و تمحیص اور ریسرچ اور تحقیق کرنا اور ان کے اسلامی حل سامنے لانا ہے جو فی الوقت ہر جگہ مسلمانوں کو درپیش ہیں اور اپنے حل کا تقاضا کر رہے ہیں۔ چنانچہ اکیڈمی مذکورہ نے گزشتہ چند سالوں میں مختلف نوع کے جدید فقہی مسائل پر متعدد سیمینار منعقد کئے جن میں مختلف دارالعلوموں اور علمی اداروں سے تعلق رکھنے والے ممتاز علماء کرام شریک ہوئے اور اپنے علمی و تحقیقی مقالات پڑھے۔ ایک سیمینار کرنسی نوٹوں کی شرعی حیثیت کے موضوع پر بھی ۸'۹'۱۰ اور ۱۱/ دسمبر ۱۹۸۹ء کو بمقام ہمدرد نگر نئی دہلی میں منعقد ہوا۔ اس سیمینار میں موضوع سے متعلق پندرہ مقالے پڑھے گئے' جن میں بحالات موجودہ کرنسی نوٹوں کی شرعی حیثیت اور ان کے متعلق شرعی

احکام پر سیر حاصل بحث و تحقیق کی گئی' اور اس بارے میں علماء کرام کے نتائج غور و فکر کھل کر سامنے آئے۔ بعد میں اکیڈمی نے مختلف سیمیناروں کی رودادوں کے ساتھ ان میں پڑھے اور پیش کئے گئے مقالات کو کتابی شکل میں شائع کیا۔ اب تک پانچ جلدیں جدید فقہی مباحث کے نام سے پہلے بھارت میں شائع ہوئیں اور کچھ عرصہ پہلے کراچی کے ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ نے ان کو پاکستان میں شائع کیا۔ چنانچہ اب وہ کتاب پاکستان کے ہر شہر میں باسانی مل رہی ہیں۔ پاکستانی علماء کو اس کتاب کا بغور مطالعہ اور اس سے ضرور استفادہ کرنا چاہئے۔ اس کتاب کی دوسری جلد کے پہلے حصہ میں وہ مقالات جمع کر دیئے گئے ہیں جو کرنسی نوٹوں کی شرعی حیثیت سے متعلق ہیں۔ ان مقالات میں کرنسی نوٹوں کے قرض کے مذکورہ بالا مسئلہ پر بھی بحث کی گئی ہے اور اکثریت نے دوسری رائے کو صحیح کہا اور اختیار کیا ہے۔ یعنی جب افراط زر کی وجہ سے ان کی قوت خرید میں کمی واقع ہو جائے تو قرض کی ادائیگی سونے کے معیار سے کی جائے۔ اس صورت میں اگر ادا کردہ نوٹوں کی تعداد بڑھ جائے تو عدل کی رو سے جائز ہے۔ اس میں ربا کا احتمال نہیں کیونکہ حقیقت میں یہ قرض کے اصل مال پر سرے سے کوئی زیادتی ہے ہی نہیں بلکہ کمی کی تلافی ہے۔

اس بارے میں دارالعلوم دیوبند کے دارالافتاء کا ایک فتویٰ ملاحظہ فرمایئے جو صدر شعبہ افتاء حضرت مولانا مفتی نظام الدین نے تحریر فرمایا اور نظام الفتاویٰ جلد اول میں شائع ہوا ہے' جس استفتاء کے جواب میں فتویٰ دیا گیا ہے وہ اس طرح ہے :

☆ ایک آدمی نے دوسرے آدمی کے پاس سے دس ہزار روپے بطور قرض لئے۔ اب وہ آدمی اس کا قرض دس سال بعد ادا کرتا ہے۔ اس درمیان میں سرکاری طور پر روپیہ کی قیمت آدھی گھٹادی گئی ہے۔ یعنی آج سے دس سال پہلے روپیہ کی جو قیمت تھی وہ آج اس سے آدھی رہ گئی جس کا سرکاری طور پر اعلان بھی ہو چکا ہے جس کو سرکاری اصطلاح میں ڈی ویلیویشن کہتے ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ قرض لینے والا دس ہزار روپے ادا کرتا ہے' لیکن ان کی قیمت جن روپوں میں قرض لیا تھا اس کے مقابلہ میں پانچ ہزار ہی ہے تو کیا قرض دینے والا اسی بنیاد پر اس سے بیس ہزار کا مطالبہ کر سکتا ہے؟ اور کیا

(باقی صفحہ 54 پر ملاحظہ فرمائیں)

تعارف و تبصرۂ کتب

نام کتاب : خطبات ختم نبوت (جلد اول)
مرتب : مولانا محمد اسماعیل شجاع آبادی
ضخامت : ۳۸۴ صفحات
قیمت : ۱۵۰ روپے
ناشر : عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت' حضوری باغ روڈ ملتان

امت مسلمہ کا ہمیشہ سے یہ عقیدہ رہا کہ سلسلہ نبوت حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہو کر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو گیا۔ پہلے انبیاء خاص خاص علاقوں کے لوگوں کی طرف مبعوث ہوئے مگر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم بعد میں آنے والے تمام لوگوں کے لئے نبی رحمت بن کر آئے۔ اب نہ کوئی نیا نبی آئے گا نہ کوئی نئی امت ہو گی۔ یہ عقیدہ مسلمانوں کے تمام مسالک کے علماء و مشائخ کے ہاں متفق علیہ ہے اور کبھی اس میں شک نہیں ہوا۔ مرزا غلام احمد قادیانی ایک بڑے عالم کے طور پر ابھرا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ میں زور قلم اور طاقت لسانی کے ساتھ جھوٹ کو سچ ثابت کر سکتا ہوں۔ چنانچہ اس نے نبوت کا دعویٰ کر دیا۔ ظاہر ہے وقت کے علمائے حق کے لئے اور عام مسلمانوں کے لئے یہ بات قطعاً قابل قبول نہ تھی۔ چنانچہ ہر طرف سے مخالفت ہوئی۔ مرزا نے وقت کے انگریز حکمرانوں کی حمایت حاصل کرنے کے لئے ان کی شان میں قصیدے کہے اور اپنے کو فرنگیوں کا خود کاشتہ پودا کہا۔ اس طرح اسے واقعی بدیشی حکمرانوں کی حمایت حاصل ہو گئی۔ اور اس کے پیروکاروں کا ٹولہ بڑھتا چلا گیا۔

قیام پاکستان کے بعد علمائے حق نے مرزائیوں کے ناپاک مذہبی اور سیاسی عزائم کو بھانپ لیا تو ان کے خلاف پورے زور سے مہم کا آغاز کر دیا۔ زیر تبصرہ کتاب ان ہی علمائے ربانی کے خطبات پر مشتمل ہے' جنہوں نے مرزا کی جھوٹی نبوت کے راز کو فاش کیا اور عوام الناس پر مرزا کی تحریروں سے یہ بات واضح کر دی کہ وہ کسی طور پر بھی ایک اچھا انسان نہیں ہے' چہ جائیکہ وہ نبی ہو۔ مسلمانوں نے علماء کا ساتھ دیا' احتجاج ہوئے' علماء نے قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں' حکومت کے ساتھ تصادم ہوا۔ بہت سے مسلمانوں نے تحفظ ختم نبوت کی خاطر جام شہادت نوش کیا۔ بالآخر ذوالفقار علی بھٹو حکومت کو گھٹنے ٹیکنے پڑے اور ۷ ستمبر ۱۹۷۴ء کو مرزائیوں کو آئینی طور پر کافر قرار

دے دیا گیا۔ "خطبات ختم نبوت" میں امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے علاوہ پندرہ علمائے ربانی کی شاہکار تقاریر کو جمع کیا گیا ہے۔ جن میں نہایت شرح و بسط کے ساتھ قادیانی فتنہ کی سنگینی کو طشت ازبام کیا گیا ہے۔ اور بتایا گیا ہے کہ مرزا اپنے پیروکاروں کے علاوہ دوسرے تمام مسلمانوں کو کافر سمجھتا ہے۔ اس کے خیال میں حضرت محمد ﷺ خاتم النبین نہیں بلکہ مرزا خاتم النبین ہے۔ مرزا کی تحریریں بداخلاقی کا مرقع ہیں۔ اپنی کتاب "آئینہ کمالات" میں وہ لکھتا ہے کہ جو مجھے نہیں مانتا وہ حرامی ہے۔ پھر اپنی کتاب "نور الاسلام" میں اپنے مخالفین کو سور اور ان کی بیویوں کو کتیاں کہتا ہے۔ یوں نبوت کا دعویٰ کرنے والا خود کو ایک اچھا انسان بھی ثابت نہیں کر سکا۔ اس نے بہت سی پیش گوئیاں کیں مگر وہ بے معنی' فضول اور جھوٹی تھیں۔ کہتا تھا میں مکہ یا مدینہ میں مروں گا مگر لاہور میں ہیضہ کی وبا سے ہلاک ہوا۔ اس کی کتاب کے صفحہ ۸۸ پر مرزا کی تحریروں سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو: "غرض یہ ایک جماعت ہے جو انگریزی سرکار کی نمک پروردہ اور نیک نامی حاصل کردہ اور مورد مراحم گورنمنٹ ہے' سرکار دولت مدار ایسے خاندان کی نسبت جس کو پچاس برس کے متواتر تجربہ سے ایک وفادار اور جاں نثار ثابت کر چکی ہے۔ اس خود کاشتہ پودا کی نسبت احتیاط اور تحقیق اور توجہ سے کام لے اور اپنے ماتحت حکام کو اشارہ فرمائے کہ وہ بھی اس خاندان کی ثابت شدہ وفاداری کا لحاظ کریں"۔ اسی طرح ملکہ وکٹوریہ کو ایک خط میں لکھتا ہے: "اے ملکہ معظمہ! تیری نیک نیتی کی کشش ہے۔ میں اوپر کا نور ہوں اور تو نیچے کا نور۔ نیچے کے نور نے اوپر کے نور کو کھینچا"۔ اس طرح مرزا نے ثابت کر دیا کہ وہ خوشامدی اور مطلب پرست ہے۔ اس کے برخلاف انبیاء تو استقامت کا پہاڑ ہوتے ہیں۔ حق گوئی اور بے باکی ان کا وصف اول ہوتا ہے۔ کافر حکومت کا موید و وفادار بھی کبھی نبی ہو سکتا ہے!

مصنف کی کاوش قابل تعریف ہے کہ اس نے اکابرین کی شاہکار تقاریر محنت کے ساتھ جمع کر کے قارئین کی خدمت میں پیش کر دی ہیں۔ اس طرح ان بزرگوں کی جدوجہد' بے باکی' مستقل مزاجی اور عزم و ہمت کو آشکارا کیا گیا ہے جو بعد میں آنے والوں کے لئے یقیناً مشعل راہ ہیں۔

کتاب کی افادیت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا' البتہ کتابت کی بے شمار غلطیاں ہیں جو قاری کی طبیعت پر گراں گزرتی ہیں۔ مثلاً صفحہ ۲۲ پر درخواست کو درخواستی' صفحہ ۵۶ پر سورت کو صورت' صفحہ ۷۱ پر شعر کے اندر الفاظ آگے پیچھے' صفحہ ۹۲ پر خلافت کی بجائے خلاف' صفحہ ۹۸ پر آیت میں ھم کی بجائے ھو' صفحہ ۱۰۶ پر رسول کریم کی بجائے رسول اکریم' صفحہ ۱۳۲ پر گولی چلادی' کے بجائے گولی چلادی گئی' صفحہ ۱۴۰ پر دنوں کے بجائے دونوں لکھا ہے۔ اسی طرح کتاب کے اندر بہت سی جگہ عدم

ربط بھی قاری کو پریشان کرتا ہے۔ مثلاً صفحہ ۴۸ پر آخری پیرا "نجات سمجھتے ہیں...." سے شروع ہوتا ہے لیکن یہ ماقبل عبارت کے ساتھ مربوط نہیں۔ صفحہ ۲۱۱ پر صرف پانچ سطریں لکھی ہیں باقی صفحہ خالی پڑا ہے مگر صفحہ ۲۱۲ "فیصلہ کریں...." کے الفاظ سے شروع ہوتا ہے جو پچھلے صفحے کے ساتھ مربوط نہیں۔ صفحہ ۲۱۴ کا آخری فقرہ نامکمل ہے۔ اس طرح کی اغلاط قاری کی طبیعت میں انقباض پیدا کرتی ہیں۔ ان کی اصلاح کر کے اس مفید کتاب کو زیادہ مفید بنایا جا سکتا ہے۔ مزید یہ کہ کیا ہی بہتر ہوتا اگر ہر خطبے سے پیشتر خطیب کے نام کے ساتھ تاریخ اور مقام خطاب بھی لکھ دیا جاتا۔

(تبصرہ نگار : پروفیسر محمد یونس جنجوعہ)

بقیہ : "ایک اہم اقتصادی مسئلہ اور اس کا حل"

یہ شرعاً سود کہلا سکتا ہے؟ قرض کی لین دین نوٹوں کی شکل میں ہوئی تھی اور قیمت کی تقلیل بھی نوٹوں میں ہوئی ہے۔

جواب : اس قرض میں لئے ہوئے نوٹوں کی' قرض لینے کے زمانہ میں جتنی چاندی ملتی یا جتنا سونا ملتا تھا اتنی چاندی میں یا اتنے سونے میں جتنے نوٹ آج بوقت ادا ملیں اتنے ہی نوٹ دینے ہوں گے۔ پس نقد ان میں جو زیادہ رائج ہو گا اس کا اعتبار ہو گا۔ اور نوٹ اس کے تابع ہو گا فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔ (نظام الفتاویٰ' ص ۳۳۲' جلد اول)

علاوہ ازیں میرے ایک عالم دوست نے مجھے بتایا کہ انہوں نے اسی طرح کا ایک سوال لکھ کر بطور استفتاء پاکستان کے بڑے دار العلوموں کے دار الافتاؤں کو بھیجا اور سب نے فتویٰ کے طور پر تقریباً وہی جواب دیا جو دار العلوم دیوبند کے دار الافتاء کا تھا اور جو اوپر ذکر کیا گیا۔ لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ علماء کرام اور مفتیان عظام کی اکثریت اس پر متفق ہے کہ مسئلہ زیر بحث کے متعلق دوسری رائے ہی درست ہے۔ مسلمانوں کو اس پر ہی عمل کرنا چاہئے۔

☆ ☆ ☆

سُورۃ البقرۃ

آیات ۹۷-۹۸

ملاحظہ: کتاب میں حوالہ کیلئے قطعہ بندی (پیراگرافنگ) میں بنیادی طور پر تین ارقام (نمبر) اختیار کئے گئے ہیں۔ سب سے پہلا (دائیں طرف والا) ہندسہ سورۃ کا نمبر شمار ظاہر کرتا ہے۔ اس سے اگلا (درمیانی) ہندسہ اس سورۃ کا قطعہ نمبر (جو زیر مطالعہ ہے اور جو کم از کم ایک آیت پر مشتمل ہوتا ہے) ظاہر کرتا ہے۔ اس کے بعد والا (تیسرا) ہندسہ کتاب کے مباحث اربعہ (اللغہ، الاعراب، الرسم اور الضبط) میں سے زیر مطالعہ مبحث کو ظاہر کرتا ہے۔ یعنی علی الترتیب اللغہ کیلئے ۱، الاعراب کیلئے ۲، الرسم کیلئے ۳، اور الضبط کیلئے ۴ کا ہندسہ لکھا گیا ہے۔ بحث اللغہ میں چونکہ متعدد کلمات زیر بحث آتے ہیں اس لئے یہاں حوالہ کی مزید آسانی کے لئے نمبر اکے بعد قوسین (بریکٹ) میں متعلقہ کلمہ کا ترتیبی نمبر بھی دیا جاتا ہے۔ مثلاً ۲:۵:۱(۳) کا مطلب ہے سورۃ البقرہ کے پانچویں قطعہ میں بحث اللغہ کا تیسرا لفظ اور ۲:۵:۳ کا مطلب ہے سورۃ البقرہ کے پانچویں قطعہ میں بحث الرسم۔ وھکذا۔

۲ : ۶۰ قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ○ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ ○

۲ : ۶۰ : ۱ اللّغۃ

اس قطعہ میں کوئی نیا لفظ نہیں ہے، ماسوائے "جبریل" اور "میکل" کے، جو دو فرشتوں کے نام ہیں اور دراصل غیر عربی کلمات ہیں۔ باقی تمام کلمات بلاواسطہ (اسی شکل میں) یا بالواسطہ (مادہ اور اصل کے لحاظ سے) پہلے گزر چکے ہیں، لہٰذا ان کا صرف ترجمہ —— اور

طالبِ مزید کے لئے ـــــ لفظ کی لغوی تشریح کا گزشتہ حوالہ لکھ دیا جائے گا۔ اس کے لئے عبارت کو چند ادھورے جملوں میں تقسیم کرنا پڑے گا۔

۲ : ۶۰ : ۱(۱) [قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيلَ....]

① "قُلْ" (تو کہہ دے) جس کا مادہ "ق و ل" اور وزن اصلی "اُفْعُلْ" ہے' کے باب' معنیٰ اور ساخت میں تعلیل وغیرہ کے مفصل بیان کے لئے دیکھئے البقرہ : ۸ [۲ : ۵۰ : ۱ (۲)] نیز [۲ : ۷ : ۱ (۵)]

② "مَنْ" (جو کوئی۔ جو) دیکھئے البقرہ : ۸ [۲ : ۷ : ۱ (۴)]

③ "كَانَ" (تھا۔ ہے) جس کا مادہ "ک و ن" اور وزن اصلی "فَعَلَ" ہے' کے معنیٰ' باب اور ساخت کے لئے دیکھئے البقرہ : ۳۴ [۲ : ۲۵ : ۱ (۵)]

④ "عَدُوًّا" (دشمن) اس کا مادہ "ع د و" اور وزن "فَعُوْلٌ" ہے (جو عبارت میں منصوب آیا ہے) اس کے باب' فعل کے معنیٰ اور لفظ کی ساخت وغیرہ پر بحث کے لئے دیکھئے البقرہ : ۳۶ [۲ : ۲۶ : ۱ (۱۹)]

⑤ "لِجِبْرِيلَ" کی ابتدائی لام (الجر) یہاں مضاف کو نکرہ بنانے کے لئے استعمال ہوئی ہے' یعنی "جبریل کا ایک دشمن"۔ عام اضافت ہوتی تو "عَدُوٌّ جِبْرِيلَ" آتا۔ کلمہ "جبریل" ایک فرشتہ کے نام کے طور پر آیا ہے۔ عجمی لفظ اور عَلَم (نام) ہونے کے باعث یہ لفظ غیر منصرف ہے۔ کہا گیا ہے (تفاسیر میں) کہ یہ عبرانی زبان کا لفظ ہے جو "جبر" (بمعنی عبد یا بندہ) اور "اِیْل" (بمعنی خدا) کا مرکب ہے اور یوں اس کا مطلب "خدا کا بندہ" ہے۔ مختلف قبائل عرب میں اس لفظ کا تلفظ کئی طرح بیان ہوا ہے' یعنی "جِبْرِیْل' جَبْرَئِیل' جِبْرِیْن" (بالنون) "جَبْرِیْل" اور "جَبْرَئِیل"{۱} وغیرہ۔

● یوں اس عبارت کا لفظی ترجمہ ہوا "کہہ دے جو کوئی ہے ("ہو" یا "ہو گا")۔ بوجہ شرط ماضی میں ترجمہ نہیں ہو گا) دشمن (مخالف) جبریل کا"۔ اردو محاورے کی وجہ سے نکرہ مضاف "عَدُوًّا" کا ترجمہ نظرانداز کرنا پڑتا ہے' دراصل تو تھا "جبریل کا ایک دشمن" ـــــ اسی لئے بعض نے اس کا ترجمہ "جبریل سے عداوت رکھے" کے ساتھ کیا ہے' جو لفظ سے تو ہٹ کر ہے' مگر ایک لحاظ سے اس میں وہ "عَدُوًّا" کے نکرہ ہونے والی بات کا مفہوم آ گیا ہے' جو "جبریل کا دشمن" کہنے میں نہیں ہے۔ "قُلْ" کے مخاطب آنحضرتؐ ہیں' اس لئے احتراماً اس کا ترجمہ

{۱} دیکھئے اعراب القرآن للنحاس ۱ : ۲۵۰۔ ونثر المرجان ۱/ ۱۹۰

"تو کہہ دے" کی بجائے آپ کہہ دیجئے / تم فرمادو" سے بھی کیا گیا ہے۔ اس عبارت میں بیانِ شرط ہے۔

۲ : ۶۰ : ۱ (۲) [فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ....]

(اس عبارت سے پہلے سابقہ جملہ (نمبرا جو بیان شرط ہے) کا جواب شرط محذوف ہے' یعنی "فَلْيَمُتْ غَيْظًا" (پس مرجائے غصہ سے) یا "فَلَا مُوجِبَ لِعَدَاوَتِهٖ" (پس اس کی دشمنی کی کوئی وجہ نہیں) وغیرہ۔ اسی لئے اردو کے بعض مترجمین نے اس حصہ آیت سے پہلے "تو ہوا کرے" یا "تو یہ اس کی بے وقوفی ہے اور دشمنی کی کوئی وجہ نہیں" یا "تو اسے غصے میں مرجانا چاہئے" وغیرہ کے توضیحی اضافے کے ساتھ ترجمہ کیا ہے۔

① "فَاِنَّهٗ" جو "فَ + اِنَّ + هٗ" ہے۔ یہ "فَا" (فَ) معنی پس / سو' جواب شرط والی "فا" نہیں ہے (ورنہ آگے آنے والے صیغہ ماضی "نَزَّلَ" کا ترجمہ بھی (بوجہ جواب شرط) مستقبل میں کرنا پڑتا۔ لہٰذا یہ "فا" اس محذوف جواب شرط پر (جس کا اوپر ذکر ہوا ہے) عطف ہے' یعنی اگلے جملے کا اس جواب شرط (محذوف) سے ربط پیدا کرتی ہے۔

باقی "اِنَّهٗ" (بے شک اس نے) "اِنَّ" اور اس کے اسم (ضمیر منصوب) پر مشتمل ہے اور ضمیر "هٗ" کا مرجع "جبریل" ہے۔

② "نَزَّلَهٗ" (اس نے اسے اتارا) فعل "نَزَّلَ يُنَزِّلُ" (اتارنا۔ نازل کرنا) کے معنی و استعمال پر البقرہ : ۲۳ [۲ : ۱۷ : ۱ (۲)] میں بات ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ضمیر منصوب "هٗ" ہے' جس کا مرجع یہاں قرآن مجید ہے' جو اگرچہ اس سے پہلے عبارت میں مذکور نہیں ہوا۔ قرآن کریم کا اس طرح ذکر (بذریعہ ضمیر بغیر سابق ذکر) کئی جگہ آیا ہے اور یہ انداز بیان صاحب قرآن (ﷺ) کی عظمت و اہمیت کو واضح کرتا ہے۔ یہ وہ مقامات ہیں جہاں مفہوم کو سمجھنے کے لئے صرف عربی گرامر کا جاننا کافی نہیں ہے' بلکہ قرآن کریم کا مجموعی اسلوب اور انداز بیان سامنے رکھنا پڑتا ہے۔

③ "عَلٰى قَلْبِكَ" (تیرے دل پر) "عَلٰى" (حرف الجر) یہاں "پر" کے معنی میں ہے' دیگر استعمالات کے لئے [۱ : ۶ : ۱ (۳)] دیکھئے۔ آخری ضمیر مجرور "كَ" معنی "تیرا" ہے اور لفظ "قَلْب" (دل) کی مفصل لغوی بحث [۲ : ۶ : ۱ (۲)] میں ہو چکی ہے۔

④ "بِاِذْنِ اللّٰهِ" (اللہ کے حکم سے)۔ "بَا" (بِ) کے استعمالات پر بحث استعاذہ میں اور البقرہ : ۴۵ [۲ : ۳۰ : ۱ (۱)] میں گزری تھی۔ اسم جلالت "اللّٰه" اور باء الجر "بِ"

کے درمیان کلمہ "اِذْن" ہے' جس کے مادہ فعل مجرد کے باب و معنی وغیرہ پر البقرہ : ۱۹ [۲ : ۱۴ : ۱ (۹)] میں کلمہ "آذَان" (جمع اُذُن بمعنی کان) کے ضمن میں بات ہوئی تھی۔ زیر مطالعہ کلمہ "اِذْن" ویسے تو ثلاثی مجرد فعل کا مصدر ہے مگر یہ بطور اسم بھی استعمال ہوتا ہے (یعنی "اجازت دینا" اور "اجازت" دونوں طرح)۔ یہاں یہ لفظ دراصل تو "اجازت" ہی کے معنی میں تھا مگر یہ معنی "حکم" اس لئے لیا گیا ہے کہ جبریلؑ نے قرآن اتارنے کی اجازت خود تو حاصل نہیں کی بلکہ اسے خود اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیا تھا' اس لئے اس کا ترجمہ یہاں "حکم" ہی کیا گیا ہے۔ جبریلؑ فرشتے کا کام پیغمبروں تک اللہ کا کلام اور اس کے احکام پہنچانا ہے۔

● یوں اس عبارت "فانہ نزّلہ علی قلبک باذن اللہ" کا لفظی ترجمہ بنتا ہے "پس بے شک اسی نے اتارا اس کو تیرے دل پر اللہ کی اجازت سے"۔ اکثر مترجمین نے یہاں "اس کو" (نَزَّلَہ کی ضمیر مفعول) کا وضاحتی ترجمہ بصورت "یہ کلام' یہ قرآن' اس قرآن' یہ کتاب" وغیرہ سے کیا ہے۔ بعض نے "نَزَّلَ" کا ترجمہ "پہنچا دیا ہے" (قلب تک) اور "ڈالا ہے" (دل میں) سے کیا ہے' جو صرف محاورہ اور مفہوم کے لحاظ سے درست ہے' ورنہ اصل لفظ سے تو ہٹ کر ہے۔ "باذن اللّٰہ" کے لفظی معنی اور ترجمہ (حکم) کی مناسبت پر ابھی اوپر بات ہوئی ہے۔

۲ : ۶۰ : ۱ (۳) [مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ]

یہ عبارت کوئی مستقل جملہ نہیں بلکہ یہ سابقہ جملہ کے "نزّلہ" کی ضمیر مفعول (جس سے مراد قرآن کریم ہے) کا "حال" ہو کر اسی جملے (نمبر ۲ بالا) کا ہی حصہ ہیں۔ کلمات کا ترجمہ (اور مزید کے طالب کے لئے) گزشتہ حوالہ درج ذیل ہے۔

① "مُصَدِّقًا لِّمَا" (سچا کہنے والا اس کو جو) یعنی "تصدیق کرنے والا ہوتے ہوئے اس کی جو" ـــــ یہی ترکیب اس سے پہلے البقرہ : ۴۱ [۲ : ۲۸ : ۱ (۹)] میں گزر چکی ہے' جس میں "مصدِّق" اور "لِ" اور "مَا" سب کی وضاحت ہوئی تھی۔

② "بَيْنَ يَدَيْهِ" (اس کے دونوں ہاتھوں کے درمیان' یعنی اس کے آگے' اس کے پہلے' اپنے سے قبل)۔ لفظ "یَد" (ہاتھ) کی لغوی وضاحت کے علاوہ قریباً یہی ترکیب "بَيْنَ يَدَيْهَا" کی صورت میں البقرہ : ۶۶ [۲ : ۴۶ : ۱ (۶)] میں گزری ہے۔ وہاں آخر پر واحد مؤنث ضمیر مجرور "ھا" تھی' یہاں واحد مذکر ضمیر مجرور "ہ" ہے۔

③ "وَهُدًى" (اور ہدایت۔ رہنمائی ہوتے ہوئے) لفظ "ھُدًی" کی مفصل لغوی تشریح

کے لئے دیکھ لیجئے البقرہ : ۲[۲ : ۱ : ۱ (۶)] اور اس کے مادہ اور اس سے فعل مجرد وغیرہ کی بات الفاتحہ : ۱[۱ : ۵ : ۱ (۱)] میں گزری تھی۔

④ "وَبُشْرٰی" (اور خوشخبری ہوتے ہوئے) کلمہ "بُشْرٰی" (بمعنی خوشخبری) کے مادہ (ب ش ر) سے فعل مجرد وغیرہ کی بحث البقرہ : ۲۵[۲ : ۱۸ : ۱ (۱)] میں گزری تھی۔ اس مادہ سے ماخوذ یہ لفظ (بشری) معرفہ' نکرہ' مفرد' مرکب صورتوں میں قرآن حکیم کے اندر ۱۵ جگہ وارد ہوا ہے۔ لفظ "بِشَارَۃ" (اردو میں "بشارت") بھی اس کے ہم معنی ہے۔

⑤ "لِلْمُؤْمِنِیْنَ" (ایمان لانے والوں کے لئے)۔ کلمہ "مُؤْمِن" (جس کی جمع مجرور "مُؤْمِنِین" یہاں آئی ہے) کے مادہ "أمن" سے باب افعال "آمَنَ یُؤْمِنُ" کے معنی وغیرہ پر البقرہ : ۳[۲ : ۲ : ۱ (۱)] میں بات ہو چکی ہے۔ یہ (مؤمن) اس فعل سے صیغہ اسم الفاعل ہے جس کی جمع سالم مجرور "مُؤْمِنِین" کے معنی "ایمان لانے والے" ہے۔

● یوں اس عبارت کا لفظی ترجمہ بنتا ہے "سچا کہنے والا ہوتے ہوئے اس کو جو اس کے دونوں ہاتھوں کے آگے (سامنے) ہے اور ہدایت ہوتے ہوئے اور خوشخبری ہوتے ہوئے ایمان لانے والوں کے لئے"۔ اردو محاورے میں اس طرح "حال" کا ترجمہ فٹ نہیں بیٹھتا اس لئے اسے کم از کم "اور حالت یہ ہے کہ وہ (قرآن) اپنے سے پہلے کی تصدیق کرنے والا اور ہدایت اور خوشخبری ہے اہل ایمان کے لئے" کرنا پڑا۔ بہت سے مترجمین نے "مُصَدِّق" اسم الفاعل کا ترجمہ فعل "یُصَدِّقُ" کے ساتھ کر لیا ہے۔ یعنی "تصدیق کر رہا ہے" اور "سچ بتاتا ہے" اور "تصدیق کرتا ہے" اور بعض نے "حال" یا "حالت یہ ہے" کی بجائے صرف خبر کی طرح ترجمہ کر دیا ہے۔ یہ سب اردو محاورے کے باعث کرنا پڑا ہے' کیونکہ عربی کے "حال" ہونے والی ترکیب اردو عبارت کی ساخت میں غیر مانوس لگتی ہے' لہٰذا اسے "خبر" یا "صفت" کے طور پر بیان کرنا پڑتا ہے۔

۲ : ۶۰ : ۱ : (۴) [مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰلَ]

یہ بھی مکمل جملہ نہیں بلکہ اس میں صرف بیان شرط ہے' جواب شرط اس سے اگلے جملے میں ہے۔ مفردات کا الگ الگ ترجمہ مع گزشتہ حوالہ (برائے ضرورت مند) درج ذیل ہے :

① "مَنْ" (جو کوئی بھی' جو) یہاں موصولہ شرطیہ ہے[۲ : ۷ : ۱ (۴)]

② "كَانَ" (ہے۔ ہو گا) دیکھئے اوپر شروع آیت "قُلْ مَنْ كَانَ...."

③ "عَدُوٌّ لِّلّٰهِ" (اللہ کا دشمن۔ اللہ سے عداوت رکھنے والا) یہی الفاظ اوپر گزرے ہیں۔ وہاں "عَدُوًّا" کے بعد "لِجِبْرِيلَ" تھا یہاں "لِلّٰهِ" ہے۔

④ "وَمَلٰٓئِكَتِهٖ" (اور اس کے فرشتوں کا (دشمن))۔ لفظ "مَلَائِكَة" کے مادہ اور اشتقاق کی مفصل بحث البقرہ : ۳[۲ : ۲۱ : ۱ (۲)] میں گزر چکی ہے' یہاں ضمیر مجرور (ہ) اللہ تعالیٰ کے لئے ہے' یعنی "لِلّٰهِ وَلِمَلٰٓئِكَتِهٖ" مراد ہے۔

⑤ "وَرُسُلِهٖ" (اور اس کے رسولوں کا (دشمن))۔ "وَ" (اور) اور آخری ضمیر (ہ) بمعنی "اس کے" کو چھوڑ کر باقی لفظ "رُسُل" ہے' جو "رَسُول" (پیغمبر) کی جمع ہے۔ اس مادہ (ر س ل) کے فعل مجرد کی بحث کے علاوہ (جو قرآن میں استعمال نہیں ہوا) اور خود لفظ "الرسل" (جو اس کی معرف باللام شکل ہے) پر البقرہ : ۸۷[۲ : ۵۳ : ۱ (او ۴)] میں بات ہوئی تھی۔

⑥ "وَجِبْرِيلَ" (اور جبریل کا) اس پر ابھی اوپر بات ہوئی ہے۔

⑦ "وَمِيكٰىلَ" (اور میکائیل کا) لفظ "میکل" خاص قرآنی رسم ہے' اردو میں یہ "میکائیل" استعمال ہوا ہے۔ "جبریل" کی طرح یہ بھی ایک فرشتہ کا نام ہے اور یہ بھی دراصل عبرانی زبان کا لفظ ہے اور اس کے معنی بھی "خدا کا معمولی بندہ" بتائے جاتے ہیں اور اس نام کو بھی اہل عرب چار طرح بولتے ہیں یعنی "میکال" (اہل حجاز کی بولی میں) اور میکائِل اور "میکایِل" اور "میکاأل"{۱}

● یوں اس زیر مطالعہ عبارت کا ترجمہ لفظی بنتا ہے "جو کوئی بھی ہو (گا) دشمن (دشمنی رکھے گا) اللہ کے لئے اور اس کے فرشتوں کا اور اس کے پیغمبروں کا اور جبرئیل اور میکائیل (فرشتوں) کا..." اور اسے سلیس بنانے کے لئے اردو فقرے کی ترتیب الفاظ میں کچھ ردوبدل کرلیا جاتا ہے۔

⑧ "فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ" یہاں ابتدائی "فَ" جوابِ شرط والی ہے کیونکہ اس کے بعد جملہ اسمیہ آیا ہے۔ یہاں (سابقہ آیت کی طرح) کسی محذوف جواب شرط کی ضرورت نہیں۔ عبارت کے تمام الفاظ بہت آسان اور پہلے کئی بار گزر چکے ہیں۔ بلکہ ان میں سے "فا" (فَ) (پس)' "اِنَّ" (بے شک) اور "عَدُوّ" (دشمن) تو اسی قطعہ میں گزرے ہیں اور "الکٰفِرین" ـــــ جو "کفر یکفُر" سے اسم الفاعلین (مجرور بلام الجر) ہے ـــــ اس پر تفصیلی بات البقرہ : ۱۹[۲ : ۱۴ : ۱ (۱۴)] میں ہوئی تھی' بلکہ یہ لفظ تو اردو میں اتنا عام ہے کہ تمام مترجمین نے اس کا ترجمہ ہی "کافروں" رہنے دیا ہے۔

{۱} اعراب القرآن للنحاس ۱/۲۵۱۔ نیز نثر المرجان ۱/۱۹۱

● اس عبارت کا لفظی ترجمہ تو ہے : "پس بے شک اللہ دشمن ہے کافروں کے لئے" چونکہ "الکافرین" کا لام تعریف یہاں عہد کا ہو سکتا ہے' یعنی وہ کافر جن کی بات ہو رہی ہے' اس لئے بعض مترجمین نے اس کا ترجمہ "ایسے کافروں کا" اور بعض نے "ان کافروں کا" سے کیا ہے۔ اسی طرح جوابِ شرط پر "اِنَّ" آنے کے زور کو بعض نے ترجمہ میں "اللہ بھی (دشمن ہے)" کی صورت میں ظاہر کیا ہے۔

● اس قطعہ میں جبریل و میکائیل کا ذکر آنے کی وجہ سے' ان فرشتوں کے بارے میں مزید وضاحت اور آیت میں ان سے جس دشمنی کا ذکر ہے اس کا پس منظر یعنی آیت کا شانِ نزول جاننے کے لئے کسی اچھی اور مستند تفسیر کو دیکھ لیجئے۔ کیونکہ یہ بات تو آیت کے ترجمہ سے ہی معلوم ہو جاتی ہے کہ اس میں بیان کردہ بات کا کوئی خاص پس منظر ہے۔ وہ کیا ہے؟ اس کا جواب تفاسیر میں ملتا ہے۔

۲ : ۶۰ : ۲ الاعراب

زیرِ مطالعہ دونوں آیات بلحاظِ ترکیب نحوی دو شرطیہ جملوں پر مشتمل ہیں۔ ہر ایک آیت ایک بیان شرط اور ایک جواب شرط پر مشتمل ہے۔ ـــــ تاہم طوالت کی بنا پر ہم ہر ایک آیت کے اجزاء کو الگ الگ بیان کریں گے۔

① قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيلَ.....

[قُلْ] فعل امر معروف مع ضمیر الفاعل "اَنْتَ" ہے اور "قُلْ" کے بعد آنے والی عبارت اس "قُلْ" کا مقول (کہی گئی بات) ہو کر مفعول للذا محلاً منصوب سمجھی جائے گی۔ [مَنْ] اسم موصول یہاں بطور اسم شرط آیا ہے۔

[كَانَ] فعل ناقص ماضی صیغہ واحد مذکر غائب ہے' جس میں اس کا اسم "هُوَ" موجود ہے' جو "مَنْ" کے لئے ہے [عَدُوًّا] كَانَ کی خبر (للذا) منصوب ہے۔ [لِجِبْرِيلَ] لام الجر اور اس کا مجرور "جِبْرِيلَ" مل کر متعلق خبر "كَانَ" ہیں۔ اس "جبریل" میں علامت جر "ل" کی فتحہ (ـَـ) ہے کیونکہ لفظ "جبریل" بوجہ عجمیت اور علمیت غیر منصرف ہے۔ یہاں تک بیان شرط مکمل ہوتا ہے۔

② فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَىٰ قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللَّهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَبُشْرَىٰ لِلْمُؤْمِنِينَ

[فَ] بظاہر جواب شرط کی ہے' لیکن اگر یوں سمجھا جائے تو اگلے فعل "نَزَّلَ" کا ترجمہ "اتارے گا" ہونا چاہئے' کیونکہ شرط اور اس کے جواب کا تعلق زمانہ مستقبل سے ہوتا ہے' شرط

ماضی پر نہیں ہوتی۔ اس لئے نحویوں نے یہاں اصل جواب شرط محذوف مانا ہے' جیسا کہ اوپر حصہ "اللغۃ" میں مع اضافی ترجمہ بیان ہوا ـــــ تاہم یہ ایک فنی سی وجہ ہے۔ بلحاظ معنی اس (زیر مطالعہ) عبارت کو بھی جواب شرط قرار دینا چنداں غلط بھی نہیں ہو گا۔ یوں [فَاِنَّہٗ] فَا برائے رابطہ یا عاطفہ ہے اور "اِنَّہٗ" حرفِ مشبّہ بالفعل "اِنَّ" اور اس کے اسم منصوب (ضمیر "ہ") پر مشتمل ہے' جس کی خبر [نَزَّلَہٗ] ہے جو فعل ماضی معروف "نَزَّلَ" اور اس کے مفعول بہ (ضمیر منصوب) "ہ" پر مشتمل ہے۔ [عَلٰی قَلْبِکَ] میں "عَلٰی" حرف الجر اور "قَلْبِکَ" مضاف و مضاف الیہ (قَلْب + کَ) مل کر مجرور ہے اور یہ مرکب جاری متعلق فعل (نزّل) ہے۔ اسی طرح [باذنِ اللّٰہ] بھی حرف الجر (بِ) اور مرکب اضافی "اذنِ اللّٰہ" مجرور پر مشتمل ہے اور یہ مرکب جاری "باذن اللہ" بھی دوسرا متعلق فعل ہے۔ ان دونوں تراکیب (علٰی قلبک اور "باذن اللّٰہ") میں مضاف کلمہ "قلب" اور "اذن" مجرور بالجر اور بوجہ مضاف ہونے کے خفیف بھی آئے ہیں۔ یہاں تک ویسے تو جملہ مکمل ہو جاتا ہے مگر "نزّلہ" کی ضمیر مفعول کا مرجع (قرآن) چونکہ پہلے مذکور نہیں اس لئے اس سے اگلی عبارت میں اس (قرآن) کے پے در پے تین "حال" لائے گئے ہیں تاکہ واضح ہو جائے کہ بات قرآن کریم کی ہو رہی ہے' کیونکہ یہ "حال" (یا صفات) صرف قرآن کریم ہی پر منطبق ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ [مُصَدِّقًا] پہلا حال ہے' یعنی حالت یہ ہے کہ وہ (قرآن) تو تصدیق کرنے والا ہے [لِمَا] لام الجر اور "مَا" موصولہ ہے۔ [بَیْنَ یَدَیْہِ] میں "بَیْنَ" ظرف مضاف اور "یَدَیْہِ" خود مرکب اضافی (یَدَی مضاف + "ہ" مضاف الیہ) اس ظرف کی طرف مضاف ہے' اسی لئے "یَدَیْ" مجرور (یعنی "یَد" کا تثنیہ مجرور) ہے۔ یہاں علامتِ جر "یا" ماقبل مفتوح (ـَیْ) ہے۔ اور یہ سارا مرکب اضافی "بَیْنَ یَدَیْہِ" اسم موصول "مَا" کا صلہ ہے اور پھر یہ صلہ موصول مجرور (بلام الجر) ہیں اور یہ مرکب جاری (لِمَا بین یدّیہِ) "مصدّقًا" سے متعلق ہیں۔ یعنی اس کے معنی فعل (تصدیق کرنا) سے متعلق ہیں' کہ کس کی تصدیق کرتا ہے؟ کا جواب اس میں موجود ہے اور ایک طرح سے یہ فعل "تصدیق کرنا" کے مفعول (بلحاظ معنی) ہیں۔ اسی طرح [وَھُدًی] میں "ھُدًی" بھی حال ہونے کی وجہ سے اور سابقہ منصوب حال (مصدّقًا) پر معطوف ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ علامت نصب بظاہر تنوین نصب (ـًـ) ہے مگر دراصل یہ لفظ (ھُدًی) بھی مقصور ہوتا ہے' اس میں رفع نصب جر کی ظاہر کوئی علامت نہیں ہوتی۔ اور اسی طرح [بُشْرٰی] بھی حال ہونے اور سابقہ حال پر عطف ہونے کے باعث منصوب ہے۔ یہ بھی اسم مقصور ہے جس میں اعرابی حالت ظاہر نہیں

ہوتی۔ "لِلمُؤمِنِین" جار مجرور مل کر متعلق حال (بُشرٰی) ہیں' یعنی جس طرح "لِمَا بین یدیہ"' "مصدّقاً" سے متعلق تھا اسی طرح "للمُؤمنین" کا تعلق "بشرٰی" سے ہے' یعنی یہ اس "بشرٰی" کی وضاحت ہے کہ کس کے لئے؟ یوں یہ زیر مطالعہ پوری عبارت ایک جواب شرط کی وضاحت ہے۔

③ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰلَ

اس کی ترکیب سابقہ جملے کی سی ہے۔ یعنی [مَنْ] اسم شرط (موصول) ہے' [کَانَ] فعل ناقص مع اسم (هُوَ) ہے' [عدوًّا] اس (کَانَ) کی خبر منصوب ہے' [لِلّٰه] جار مجرور متعلق خبر کان (عدوًّا) ہے' یعنی کس کا دشمن؟ کی وضاحت ہے۔ [وملٰئکتِہ] میں واو عاطفہ ہے "ملائکتِہ" مرکب اضافی مجرور بالعطف ہے۔ اسی طرح (ورُسلِہ) بھی واو العطف اور معطوف مجرور "رُسُلہ" پر مشتمل ہے' جس میں "رسُلہ" بھی مرکب اضافی ہے اور آگے [وجبریل] اور [ومیکٰل] بھی ہر ایک واو العطف کے ذریعے "للہ" پر عطف ہو کر مجرور ہیں۔ "جبریل" اور "میکال" "غیر منصرف ہیں' اس لئے ان پر علامت جر "ل" کی فتحہ (ـَ) ہی ہے۔ اتنا حصہ عبارت بیان شرط ہے' آگے جواب شرط آرہا ہے۔

④ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ

[فَا] برائے رابطہ ہے جو جواب شرط پر آتی ہے' [اِنَّ] حرفِ مشبہ بالفعل اور [اللہ] اس کا اسم منصوب ہے' [عدو] اس "اِنَّ" کی خبر (لہٰذا) مرفوع ہے اور [للکفرین] جار مجرور (لام الجر + الکافرین مجرور) مل کر متعلق خبر "اِنَّ" (یعنی "عدو" کی وضاحت) ہیں۔

۲ : ۶۰ : ۳ الرسم

بلحاظ رسم قرآنی اس قطعہ میں صرف تین کلمات قابل ذکر ہیں' یعنی میکٰل' ملئکتہ اور للکفرین۔ تفصیل یوں ہے :

① "میکٰل" جس کا تلفظ قراءتِ حفص کے مطابق "میکال" (مطابق رسم املائی) ہے۔ قرآن کریم میں یہ لفظ (جو یہاں ایک جگہ ہی آیا ہے) "کاف" کے بعد "الف" کے حذف مگر "ی" کے نبرہ (دندانہ) کے اضافہ کے ساتھ لکھا جاتا ہے۔ چونکہ اس لفظ کی بعض دوسری قراءات بھی ہیں' لہٰذا اس کا یہ عثمانی رسم الخط ان قراءتوں کا محتمل بھی ہے مثلاً قالون کی قراءت میں یہ "مِیکٰئِل" (میکائل) پڑھتے ہیں تو وہ نبرہ (دندانہ) کو ہمزہ کا نبرہ (جو "ی" کے نبرہ کی طرح ہو گا) سمجھ کر ضبط اس کے مطابق کر لیتے ہیں۔ ہمارے ہاں اس "ی" کے نبرہ کو "الف بصورت یاء" (موسٰی کی طرح) سمجھ لیا جاتا ہے۔

(۲) "لملئکتہ" کے کلمہ "ملئکۃ" (جس کی عام املاء "ملائکۃ" ہے) قرآن کریم میں یہاں اور ہر جگہ "بحذف الالف بعد اللام" لکھا جاتا ہے۔ نیز دیکھئے [۲ : ۲۱ : ۳] میں اس کلمہ کے رسم کی بحث۔

(۳) "للکفرین" جس کی رسم املائی "للکافرین" ہے۔ یہ لفظ (کفرین) یہاں اور ہر جگہ "بحذف الالف بعد الکاف" لکھا جاتا ہے۔ بلکہ جمع مذکر سالم عموماً ہر جگہ بحذفِ الف ہی لکھا جاتا ہے۔ مزید بحث کے لئے دیکھئے [۲ : ۱۴ : ۳]۔

۲ : ۶۰ : ۴ الضبط

اس قطعہ کے بعض کلمات کا ضبط خصوصاً دلچسپ ہے۔ ذیل کے نمونوں سے ضبط کا یہ تنوع سمجھا جاسکتا ہے۔ جہاں صرف حرکات کی شکل کا فرق ہے (ـَ ـِ ـُ / ـً ـٍ ـٌ) اسے دوبارہ نہیں لکھا گیا۔

قُلْ' قُلْ / مَنْ' مَنْ' مَن / كَانَ' كَانَ' كَانَ / عَدُوًّا / لِّجِبْرِيْلَ' لِجِبْرِيلَ' لِجِبْرِيلَ / فَاِنَّهٗ' فَاِنَّهٗ' فَإِنَّهُۥ' فَاِنَّهٗ / نَزَّلَهٗ' نَزَّلَهٗ' نَزَّلَهُۥ / عَلٰى' عَلَىٰ / قَلْبِكَ' قَلْبِكَ / بِاِذْنِ' بِاِذْنِ' بِإِذْنِ / اللّٰهِ' ٱللَّهِ' اَللَّهِ / مُصَدِّقًا' مُصَدِّقاً / لِّمَا' لِّما' لِّمَا / بَيْنَ' بَيْنَ / يَدَيْهِ / وَهُدًى / وَّ / بُشْرٰى' بُشْرٰى / لِلْمُؤْمِنِيْنَ' لِلْمُؤْمِنِينَ' لِلْمُؤْمِنِينَ / مَنْ كَانَ (مثل سابق) / عَدُوًّا / لِلّٰهِ' لِلَّهِ / وَمَلٰٓئِكَتِهٖ' مَلٰئِكَتِهٖ' مَلٰٓئِكَتِهِۦ' مَلَٰٓئِكَتِهِۦ / وَرُسُلِهٖ' رُسُلِهِۦ / وَجِبْرِيْلَ' جِبْرِيلَ' جِبْرِيلَ / وَمِيْكٰلَ' مِيكَٰلَ / فَاِنَّ' فَاِنَّ' فَإِنَّ / اللّٰهَ' ٱللَّهَ' اَللَّهَ / عَدُوٌّ / لِلْكٰفِرِيْنَ' لِلْكٰفِرِينَ' لِلْكَٰفِرِينَ '

خلافت کی اصل حقیقت اور اس کا تاریخی پس منظر
اور عہد حاضر میں اس کے دستوری و قانونی اور معاشی و معاشرتی ڈھانچے اور اس کے
قیام کے لئے سیرت نبویؐ سے ماخوذ طریق کار کی تشریح پر مشتمل

ڈاکٹر اسرار احمد

داعی تحریک خلافت پاکستان
کے چار جامع خطبات کا مجموعہ' بعنوان :

خطبات خلافت

سفید کاغذ' صفحات : 212' قیمت : 50 روپے
شائع کردہ : مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

1924ء میں خلافت کی تنسیخ کے بعد سے 1969ء تک
عالم اسلام کے کسی متحد نظام یا ادارہ کے قیام کی مساعی کے جائزہ پر مشتمل ایک تاریخی
دستاویز جو گوشہ خلافت کے عنوان سے ندائے خلافت میں بالاقساط شائع کی جاتی رہی

استنبول سے رباط تک

تالیف :
عمران این حسین
ترجمہ و تلخیص از محمد سردار اعوان
تقدیم از قلم ڈاکٹر اسرار احمد
سفید کاغذ' صفحات : 110' قیمت : 30 روپے
شائع کردہ : مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور